رجسٹرڈ ایل لاہور ۵۳۳

جلد ۵۹ عدد ۵

فروری ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۹	فروری ۱۹۶۳ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

کسے خبر تھی کہ اس خطۂ پاک کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں کی اجتماعی زندگی میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اصول پرستی کی جگہ مفاد پرستی، ایثار کی جگہ خود غرضی، اتفاق و اتحاد کی جگہ تشتت و افتراق، دُور اندیشی کی جگہ کوتاہ بینی اور فہم و فراست کی جگہ سطحی جذباتیت لے لیگی۔ پھر یہ ملک رنگ، نسل اور زبان کی جن غیر اسلامی عصبیتوں کو مٹانے کے لیے قائم کیا گیا تھا وہ ختم ہونے کی بجائے پوری شدت اور قوت کے ساتھ سر اٹھائیں گی اور اسلام کا وہ مقدس اور پاکیزہ رشتہ جس نے اس قوم کے مائل بہ انتشار اجزا کو باہم جوڑ کر اسے منظم قافلہ کی صورت دی تھی وہ آہستہ آہستہ کمزور پڑتا چلا جائے گا۔ اور اس کے اضمحلال کی وجہ سے ملت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔

آپ پاکستان کے حالات کا اگر گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں سوائے برق و تجارات کے چند مظاہر کے جو زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ کی کرشمہ سازیاں ہیں، زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ ہر اعتبار سے انحطاط ہوا ہے خصوصاً حیاتِ انسانی کا وہ شعبہ جسے انسانیت سازی کہا جاتا ہے اور جس سے نوعِ بشری کو روحانی اور فکری غذا میسر آتی ہے وہ تو بالکل برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے فکر و نظر کے زاویوں میں انتشار اور اُن کے قلب و نگاہ میں بڑی تیزی کے ساتھ فساد پیدا ہو رہا ہے۔ اور اس طرح اُن کی مادی ترقی بھی اُن کے لیے مفید اور کارآمد ہونے کی بجائے اُن پر عذاب بن کر مسلط ہو رہی ہے۔ صنعتی نظام کی کونسی برائی ہے جو اس خطۂ پاک میں پرورش نہیں پا رہی۔

ملک کی بیشتر پیداوار پر ایک نہایت ہی قلیل سا طبقہ دادِ عیش دینے میں مصروف ہے خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر جنسی انارکی کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ بے پردگی، بے حیائی اور فحاشی کا سیلاب عفت و عصمت کے مضبوط سے مضبوط قلعوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر انہیں مسمار کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔ پھر مختلف طبقات کے درمیان محبت اور مودّت کے رشتے ختم ہو رہے ہیں اور ان کی بجائے تلخی، بے اعتمادی اور عناد اجتماعی زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

کسی قوم کے اندر اس نوعیت کے تباہ کن رجحانات کا پیدا ہو جانا کوئی نیک فال نہیں ہوتا۔ یہ ترقی کی علامت نہیں بلکہ تنزل اور بربادی کا پیغام ہیں، یہ اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ قوم کے اندر تعمیری صلاحیتوں کے سارے چشمے سوکھ گئے ہیں اور اب تخریب کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے۔

یہ رجحانات بھی اپنے اندر تشویش کا کافی سامان رکھتے ہیں اور کوئی زندہ قوم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتی۔ لیکن ہمارے نزدیک ان سے کہیں زیادہ تشویشناک مایوسی و قنوطیت کی وہ خوفناک لہر ہے جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے قوم کے عزائم ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں اور اس کے احساسات کے اندر افسوسناک حد تک اضمحلال پیدا ہو چکا ہے۔ جس قوم کی آرزوؤں اور امنگوں پر مردنی چھا جائے اور جس کی تمناؤں کے نخلستان افسردگی کی وجہ سے اجڑنے لگیں، اس کے متعلق یہ سوچنا کہ اس پر بہار آ چکی ہے ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے جا ملتے ہیں۔

یہاں انسان کے ذہن میں بالکل فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انحطاط کا یہ سلسلہ بالکل غیر متوقع طور پر، محض بخت و اتفاق کی وجہ سے شروع ہو گیا ہے یا اس کے کچھ ایسے اسباب ہیں

جن میں ہماری غلط روی کا دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اُس نے آج تک کسی قوم کو ہلاکت اور بربادی سے دوچار نہیں کیا جس نے خود آگے بڑھ کر بربادی کے اس انجام کو پہنچنے کے لیے حماقتوں پر حماقتیں نہیں کیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو ملک اتنی مقدس آرزوں اور پاکیزہ ارادوں کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا وہ پندرہ سال گزرنے کے بعد آج ہر قسم کے فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا ہے اور یہاں نیکی اور بھلائی کی تخم ریزی ہونے کی بجائے منکرات کی جھاڑ جھنکار بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس تشویشناک صورتِ حال کو بدلنے کے لیے یہ بےحد ضروری ہے کہ سب سے پہلے اُن اسباب کا کھوج لگایا جائے جنہوں نے ہماری اجتماعی زندگی میں ان فتنوں کو جنم دیا ہے۔ جب تک فساد کے اصل مرکز کی نشاندہی نہ کی جائے اس کے تدارک کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

ہمارے نزدیک اس ساری خرابی کی اصل جڑ ہمارے اصحابِ اقتدار کا وہ منافقانہ رویہ ہے جو انہوں نے اسلام کے بارے میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی اختیار کیا اور جس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

پوری دنیا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل محرک نظامِ اسلامی کے احیا کا نصب العین تھا۔ اسی کی کشش نے جمود زدہ مسلمانوں کے خون کو گرم اور اُن کے مضمحل ارادوں کو جوان کیا اور انہوں نے اس مقدس مقصد کے حصول کے لیے جان و مال کے زبردست زیاں اور عزت و آبرو کے ناقابلِ بیان نقصان سے یکسر بےپروا ہو کر اپنی قسمت کو اس جد و جہد میں جھونک دیا۔ انہیں اس نصب العین کے حاصل کرنے میں جس قسم کے شدائد اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ ان سے بےخبر نہ تھے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے "رہبرانِ ملت" جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسلمانوں کی عام آبادی ان سارے خطرات سے پوری طرح آگاہ تھی جو اس کشمکش کے نتیجے میں پیش آنے والے تھے۔ لیکن انہوں نے ان ساری

بربادیوں کو خود آگے بڑھ کر اس بنا پر دعوت دی کہ چلیے آج ہم اگر بالکل برباد بھی ہو جائیں تو کچھ پروا نہیں لیکن ہماری ان قربانیوں سے ایک ایسا خطہ تو معرضِ وجود میں آجائے گا جہاں نظامِ اسلامی کا سدا بہار نخل بارآور ہو گا اور اس کے میٹھے اور صحت مند ثمرات سے نہ صرف ہماری آئندہ نسلیں بلکہ پوری انسانیت فائدہ اٹھائے گی۔ ہمیں اُن حضرات کی سادگی پر بڑی حیرت ہوتی ہے جو پاکستان کو محض ایک شخص کے "منطقی استدلال" کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تعمیر میں اُس آزمودہ کار جرنیل کے حسنِ تدبر کا بھی کافی عمل دخل ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کی ہڈیوں اور خون نے اینٹوں اور گارے کا کام دیا ہے۔ اس فدائیت اور جاں نثاری میں ان کے پیشِ نظر کوئی دنیاوی مقصد نہ تھا بلکہ انہوں نے یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا کہ کسی طرح اس دنیا میں وہ روشن دورِ تہذیب لوٹ آئے جس میں اُن کی دینی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہو سکے اور جس کے اندر زخموں سے چُور انسانیت پناہ لیکر آرام اور سکون حاصل کرے۔

محض مذہب کی بنیاد پر ایک الگ خطّے کا مطالبہ اہلِ دنیا اور خصوصاً مغربی اقوام کے لیے بڑا حیرت انگیز تھا۔ وہ حیرت اور استعجاب کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ یہ استفسار کرتے تھے کہ آخر ہندوستان میں بہت سی دوسری قومیں بھی تو آباد ہیں، وہ اگر متحدہ ہندوستان میں اپنی تہذیب و تمدن کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتیں تو مسلمان کیوں ہراساں اور پریشان ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات کیونکر ناممکن ہے کہ وہ دوسری اقلیتوں کی طرح اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم و عبادات اور معاشرتی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے ....

.... امورِ مملکت کے انصرام اور نظمِ اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں سے پورا پورا اشتراکِ عمل کریں۔ اس قسم کے استفسارات کا ایک ہی جواب دیا جاتا کہ "ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں قائم کر سکتے۔ کیونکہ مذہب ہی اُن کی اجتماعی زندگی کا مبداء اور اس کی اساس ہے۔ اُن کی تہذیب میں مذہب

صرف ایک عنصر کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ وہی اس تہذیب کا مدار اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اس لیے وہ مذہب کو اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، مملکتی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کریں یا حیاتِ اجتماعی کی کوئی ایسی ہیئت گوارا کر لیں جو اُن کے مذہبی احساسات و تخیلات سے مغائر ہو۔

یہ تھا وہ ٹھوس استدلال جس پر پاکستان کی جنگ لڑی گئی اور جس کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس قوم کو ایک الگ خطۂ ارضی دے دیا جائے تاکہ وہ اس کے اندر آزادی کے ساتھ اس نظام کو نافذ کر سکے جسے وہ نہ صرف دنیوی فلاح و کامرانی بلکہ اخروی نجات کا ذریعہ بھی سمجھتی ہے۔

پھر پوری ملت نے اس معاملے میں جس جوش و خروش، جس ولولے اور جس اتفاق و اتحاد کا ثبوت دیا اُسے دیکھ کر بھی غیر مسلم اقوام کو اس استدلال کی صحت کا یقین کرنا پڑا اور وہ یہ چیز باور کرنے پر مجبور ہوئیں کہ مسلم قوم کا یہ مطالبہ اُس کا بالکل فطری مطالبہ ہے جس میں کوئی دنیاوی خواہش اور مادی منفعت شامل نہیں اور وہ جیتے جی اس سے کبھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ سارا ہنگامہ محض چند مناصب کی تقسیم یا چند کرسیوں کے بٹوارے، یا بدیسی صاحب بہادروں کی حکمرانی کی بجائے دیسی حکمرانوں کی کبریائی اور ٹھاٹھ کا ہوتا تو اس میں کم از کم وہ مسلمان کبھی شریک نہ ہوتے جنہیں ہندو سامراج کے تحت لازمی طور پر رہنا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی نظامِ اسلامی کے ساتھ وابستگی اور اس کے لیے ایثار اور قربانی کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو علاقے کبھی خواب و خیال میں بھی پاکستان کا جزو نہ بن سکتے تھے اُن سے تعلق رکھنے والے اسلام کے شیدائیوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ چیز اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مطالبۂ پاکستان کے پیچھے کوئی دنیاوی غرض کارفرما نہ تھی۔ بلکہ یہ مسلمانوں کا خالصتہً دینی مطالبہ تھا جس کے تحت انہوں نے سب کچھ قربان کرنا گوارا کیا۔

یہ تھا ملت کا اخلاص اور ایثار، لیکن جس وقت پاکستان معرض وجود میں آیا، یہاں کے برسر اقتدار طبقے نے اس امت کے پاکیزہ احساسات اور مقدس جذبات کے ساتھ ایک ایسا شرمناک کھیل کھیلنا شروع کیا جسے بدعہدی کی ایک نہایت ہی المناک داستان کہا جا سکتا ہے اور جس کی نظیر شاید پوری تاریخ انسانی میں بالکل ناپید ہو۔ کسی قوم کے ساتھ اس سے بڑی بے وفائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس آئیڈیالوجی کی محبت میں اسے سرگرم عمل کیا جائے اور جس کی خاطر اسے آگ اور خون کے سمندر میں جھونک دیا جائے۔ وہ قوم جب شدائد اور مصائب کے صبر آزما مراحل سے گزر کر ساحلِ مراد پر پہنچے تو عین اسی وقت اُس آئیڈیالوجی کو ہی مشتبہ بنانے کی ناپاک کوشش کی جانے لگے۔ یہ ایک ایسا وحشتناک المیہ ہے جس سے شاید ہی دنیا کی کوئی بدنصیب قوم دوچار ہوئی ہو۔

پاکستان کا مطالبہ صرف اسلام کی بنیاد پر اٹھایا گیا اور مسلمانوں کو کہا گیا کہ ہم یہ ملک اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں۔ یہاں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کریں جو اسلام کی اجتماعی زندگی کا مظہر ہو۔ جس میں اسلامی جمہوریت کے پاکیزہ اصول کارفرما ہوں، جس کی معیشت اسلام کے پیش کردہ تصورِ عدل و انصاف کی زندہ تصویر ہو۔ جس میں لوگوں کی خانگی زندگی انفرادی کشاکش اور غم و غصہ سے پاک ہو، پڑوسی اپنے پڑوسی سے بےخوف، اور حسین سے حسین اور نوجوان سے نوجوان خاتون معاشرے کے اندر بالکل محفوظ و مامون زندگی بسر کر سکے۔ جس کے اندر انسان کی کبریائی بالکل ختم ہو کر رہ جائے اور اُس کی جگہ خالقِ کائنات کی بلاشرکتِ غیرے حاکمیت قائم ہو۔ جس میں انسانوں کے درمیان شریف و کمین، اور رنگ و نسل کے سارے مصنوعی امتیازات مٹ جائیں اور حسب و نسب کی بڑائی کی جگہ نیکی اور شرافت انسانی برتری کا واحد معیار قرار پائے۔

لیکن اسے اس قوم کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ توقعات کے یہ خواب، اور امیدوں کے یہ خاکے قلب و نگاہ کو پوری طرح نشاط و آسودگی بھی نہ بخشنے پائے تھے کہ آئیڈیالوجی

کے متعلق ہی مختلف قسم کے شکوک و شبہات پھیلائے جانے لگے۔ کبھی یہ کہا جاتا کہ اسلام نے اجتماعی زندگی کا کوئی متعین ڈھانچہ دیا ہی نہیں یہ تو محض خالق و مخلوق کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ ہے، اس لیے اسلام کو اجتماعی معاملات میں دخیل کرنا بڑا خطرناک ہے۔ کبھی یہ شوشہ چھوڑا جاتا کہ اگر ہم نے اس ملک کو اسلامی ریاست بنا دیا تو ہندوستان کو وہاں کا حکمران طبقہ ہندو سٹیٹ میں تبدیل کر دیگا اور اس سے وہاں کی مسلم آبادی کو سخت اذیت پہنچے گی۔ کبھی یہ خدشہ ظاہر کیا جاتا کہ اگر ہم اسلام کے قانونِ جرم و سزا کو یہاں جاری کر دیں تو لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹنے لگیں گے اور پھر یہ مہذب دنیا کیا کہے گی۔ کبھی لوگوں کے ذہن میں اس باطل خیال کی آبیاری کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام کے علمبرداروں کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہے، وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اس طرح منقسم ہیں کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی اگر ہم ایک فرقے کے اسلام کو یہاں نافذ کریں تو دوسرے فرقے علم بغاوت بلند کر دیں گے۔ اس طرح ملک کا بقا ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ کبھی غیر مسلم اقلیتوں کا درد لاحق ہوتا اور یہ خطرہ ظاہر کیا جاتا کہ یہاں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی بھی آباد ہے جو اسلام پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر اسلام کو ریاست کا مذہب بنا دیا جائے تو پھر اُن کا کیا بنے گا اور وہ ہمارے اس اقدام کو کس نگاہ سے دیکھیں گے۔ الغرض یہ اور اسی نوعیت کے بیسیوں موہوم خدشات گھڑ گھڑ کر لوگوں کے اندر پھیلائے جانے لگے تاکہ کسی طرح اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کو روکا جا سکے۔

عوام کے لیے برسرِ اقتدار طبقوں کا یہ طرزِ عمل بڑا عجیب اور مایوس کن تھا۔ وہ حیرت اور یاس کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ کہتے کہ آخر یہ خطرات جن کا آج ذکر کیا جا رہا ہے یہ اُس وقت بھی تو صاف نظر آ رہے تھے جب انہیں تحریکِ پاکستان کے لیے سرگرمِ عمل کیا جا رہا تھا۔ اُس وقت اگر انہیں صاف طور پر یہ بتا دیا جاتا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں کیا جائے گا تو مسلمان ہرگز یہ مصائب نہ جھیلتے جو انہیں قیامِ پاکستان کے وقت جھیلنے پڑے ہیں۔ اگر اس ملک کو ایک سیکولر

اسٹیٹ ہی بنانا مقصود تھا تو پھر متحدہ ہندوستان کے نظریہ کو کیوں نہ قبول کر لیا گیا۔ آج جو کام لاکھوں انسانوں کی جان لے کر، کروڑوں روپے ضائع کر کے اور لاکھوں عفت مآب بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو لٹا کر کیا جا رہا ہے وہ ادنیٰ سے نقصان کے بغیر ہی سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ یہ ملک اس لیے تو حاصل نہیں کیا گیا کہ چند فرنگی آقاؤں کی جگہ دیسی آقا یہاں اپنی فرمانروائی اور کبریائی کے ٹھاٹھ قائم کریں۔ اگر مسلمان عوام کو اس انجام کا علم ہوتا تو وہ کبھی بھی یہ عظیم قربانیاں دینے پر آمادہ نہ ہوتے جو انہوں نے تحریکِ پاکستان کے لیے دی ہیں۔

پاکستان کے مسلمان اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام سے آج انحراف کی جو راہیں نکالی جا رہی ہیں وہ درحقیقت کسی اخلاص اور وطن دوستی کا نتیجہ نہیں بلکہ حکمران طبقے کی ذہنی مرعوبیت کا مظہر ہیں۔ خدا بھلا کرے اسلامی نظام کے داعیوں کا کہ انہوں نے گزشتہ پندرہ برسوں میں اُن سارے خدشات کا پردہ چاک کر دیا جو اسلامی نظام کے بارے میں وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے تھے اور مسکت دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ نہ صرف اہل پاکستان کی بلکہ پوری نوعِ بشری کی فلاح و کامرانی کا راز اسی نظام کے قیام میں مضمر ہے اور اگر اس خطۂ پاک میں اس نظام کو پوری نیک نیتی کے ساتھ نافذ کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف یہ ملک ایک طاقتور اور مضبوط مملکت بنے گا بلکہ اسے دنیائے اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں سیادت کا منصب بھی حاصل ہو گا۔ لیکن اس کے لیے یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ یہاں کا حکمران طبقہ جس کے ہاتھ میں ملک کے ذرائع و وسائل اور عنانِ اقتدار ہے وہ دین کے معاملے میں اُس غیر سنجیدہ طرزِ عمل کو یکسر ترک کر کے اس کی طرف پورے اخلاص سے متوجہ ہو۔ اسے پوری دلسوزی کے ساتھ اپنانے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کی بجائے اسے صحیح معنوں میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا واحد رہنما بنائے۔ وہ جب تک اسے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنانے کا عزم بالجزم نہیں کرتا صرف اس کے ساتھ زبانی اشتغال سے یہ ملک تحریکِ اسلامی کا مولد و مسکن نہیں بن سکتا اور اس میں

وہ نور نہیں پھوٹ سکتا جس کی ضیا پاشیوں سے نہ صرف ہمارے قلب و دماغ منوّر ہوں بلکہ جو دوسری قوموں کے لیے بھی ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔

بر سرِ اقتدار طبقہ کی اسلام سے فرار کی اصل وجہ وہ فرنگی ذہنیت ہے جو مغربی نظام تعلیم و تربیت کی وجہ سے اُس کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔ یہ طبقہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے بعد اُسے اپنے فکر و نظر کے زاویوں میں، اپنے احساسات و جذبات میں، عادات و اطوار میں، اکل و شرب اور رہن سہن کے طور طریقوں میں بہت کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ پھر اسے بہت سی ایسی لذتوں سے دستکش ہونا پڑے گا جن کا مغربی تہذیب نے اُسے رسیا بنا دیا ہے۔ یہ طبقہ اپنی کسی نفسانی خواہش پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ البتہ اس بات کا ضرور متمنی ہے کہ اسلام کے اندر اُس کے ذوق اور مزاج کے مطابق بعض ایسی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں جن کی وجہ سے اُسے نفس کی کسی لذت سے دستبردار بھی نہ ہونا پڑے اور اُس کی قیادت کو بھی کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتا رہتا ہے۔

ہم یہ بات کسی جذبانیت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کی بنا پر علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ جس طرح اسلام اس ملک کے قیام کا واحد محرک ثابت ہوا بالکل اسی طرح اس ملک کی فلاح و کامرانی بلکہ اس کی بقا اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ یہ دین اس خطۂ پاک کے رہنے والوں کے لیے کوئی قصّہ پارینہ یا ماضی کی یادگار نہیں بلکہ ایک انقلاب انگیز تحریک، ایک حیرت انگیز قوتِ فکر و عمل اور ایک بیش قیمت سرمایۂ حیات ہے۔ جو لوگ اس ملک میں دینِ حق کو لیکر آئے اُن میں سے بیشتر سیرت و کردار کے اعتبار سے اُن خوش نصیب حضرات

کی طرح تو نہ تھے جنہوں نے حضور سرورِ کائنات ؐ اور اُن کے جلیل القدر رفقاء کبارؓ کی صحبت پائی تھی لیکن اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود انہوں نے اس ملک کے باشندوں کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے بہت کچھ سکھایا۔ اُن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور وہ کفر و شرک کی ضلالتوں سے نکل کر نورِ ہدایت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہ پیشانیاں جو ہر وقت غیر اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے مضطرب رہا کرتی تھیں انہوں نے خدائے واحد کی بارگاہ میں جھکنا شروع کیا۔ ملک کی غیر مسلم آبادی جس نے اسلام کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری قبول کرنے سے اعراض کیا وہ بھی اس کے حیات آفریں پیغام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے مذہبی عقائد میں صدیوں سے جو جمود پیدا ہو چکا تھا وہ آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا، اور اُس کی معاشرتی زندگی جو ذات پات کے بے رحم بندھنوں کی وجہ سے اس کے لیے عذاب بنی ہوئی تھی اُس میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اہلِ ہند پر اسلام کے کتنے احسانات ہیں، یہ ایک لمبی اور طویل داستان ہے جس کا بیان اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس ملک میں مسلمان تو درکنار غیر مسلموں نے بھی دینِ حق کی ضیا پاشیوں سے اپنے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے گوشے منور کیے ہیں اور اُن کی حیات کا کوئی حصہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ نہیں جس پر اسلام کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔ اس ضمن میں اگر تفصیل درکار ہو تو ڈاکٹر تارا چند کی کتاب "ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات" ملاحظہ فرمائیں۔ فاضل مصنف نے بڑی دیدہ دری سے ہندوستان کے تمدن پر دینِ حق کے گہرے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں آج جو فکری بیداری پائی جاتی ہے اُس میں اسلام کا حصہ بڑا نمایاں ہے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "اسلام ہندوستان کی سرزمین میں دین کے نہایت سادہ سے اصول لیکر آیا۔ اُس نے عقائد کا جو نظام پیش کیا وہ بڑا واضح اور متعین تھا اور اس کی معاشرتی تنظیم جمہوری بنیادوں پر استوار تھی۔ اس نے اس ملک پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور

نویں صدی کے ربعِ اول کے اختتام سے پہلے مالابار کا آخری تاجدار اسلام قبول کر چکا تھا۔" (ص ۲۴۳)

باقی رہے مسلمان تو اُن کے لیے یہ دین تو ہمیشہ قوت وطاقت کا واحد منبع و مخزن رہا ہے۔ یہ اسی دین کا اعجاز تھا کہ دنیا کی ایک پس ماندہ قوم عرب کے ایک گمنام گوشے سے یکایک اٹھ کر کرۂ ارضی کے ایک عظیم حصے پر چھا گئی۔ اور انسانوں کا یہ گروہ جو تہذیب وتمدن کے ابتدائی اصولوں تک سے ناآشنا تھا وہ پوری انسانیت کا ہادی اور رہنما بن گیا۔ دوسری اقوام نے اُس سے پاکیزہ سیاست سیکھی، اس کی معاشی زندگی کو دیکھ کر انہوں نے اپنی معیشت میں عدل وانصاف پیدا کرنے کی کوشش کی، اس کی معاشرت کی پیروی میں اپنی معاشرتی زندگی کو تبدیل کیا۔ الغرض مسلمانوں کو دنیا میں جو کچھ بھی برتری نصیب ہوئی وہ صرف اُسی دینِ حق کے صدقے میں تھی پھر انہوں نے علمی اور فکری میدان میں بھی اپنی جو دھاک قائم کی وہ بھی اسی اسلام کی بدولت تھی۔ اسی کی رہنمائی میں انہوں نے عقل کو اُس کی صحیح حدود سے آشنا کر کے اسے چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے اور تمدن کو کمال تک پہنچایا۔ آج جب بھی مسلمانوں کے دورِ اقبال مندی کا ذکر چھڑتا ہے تو بات پھر پھر کر اُس "پارس" تک پہنچتی ہے جس نے اس "مسِ خام" کو زرِ خالص بنایا تھا۔

اسلام کی معاشرتی اور تہذیبی فتوحات ایک طرف رہیں، تاریخ تو اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ مسلم قوم کے حفظ وبقا کا دارومدار صرف اسلام پر ہی ہے اور یہی وہ واحد سہارا ہے جس نے اسے نہایت حوصلہ شکن اور نامساعد حالات میں نہ صرف زندہ رہنے میں مدد دی بلکہ مخالفتوں کے طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اُس کے اندر عزم اور ارادہ پیدا کیا۔

قومیں اپنی حفاظت اور پاسبانی کے لیے اپنے گرد مختلف قسم کے حصار اٹھاتی ہیں کہیں تو یہ رنگ ونسل کے امتیازات کی صورت میں تعمیر ہوتے ہیں اور کہیں جغرافیائی اور لسانی حدبندیاں

یہ مقدس فرض سر انجام دیتی ہیں۔ پھر ان قلعوں کے اندر محفوظ رہ کر جو جذبہ انہیں سرگرم عمل کرتا ہے اُن کے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کے عزائم پیدا کرتا ہے اُس کا خمیر قومی اور نسلی تفاخر سے اٹھایا جاتا ہے

اُمتِ مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے سارے مادی ذرائع سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی امت ہے جو رنگ، نسل، وطن اور زبان کے امتیازات سے یکسر ناآشنا ہے۔ اور اس کی تعمیر خالص روحانی بنیادوں پر کی گئی ہے۔ پھر قومی اور نسلی تفاخر کی بجائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقدس جذبہ اس کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کر کے اِسے جوشِ عمل پر ابھارتا ہے دنیا کے مختلف خطوں میں جو مسلمان پھیلے ہوئے ہیں ان کے حالات کو آپ فی الحال نظر انداز کر کے پاک و ہند کے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ صرف اسلام نے ہی اس ملت کو فنا ہونے سے بچایا ہے اور اسی نے اِسے زندہ رہنے کی قوت و توانائی بخشی ہے۔

ہندوستان میں کتنی لاتعداد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں، لیکن وہ اپنی انفرادیت برقرار نہ رکھ سکیں اور آہستہ آہستہ ہندو تہذیب میں گم ہو کر رہ گئیں. آج اُن کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں مگر اُن کے وجود کا کہیں کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ کیا انہیں زمین نگل گئی ہے یا انہیں آسمان اُچک لے گیا ہے۔ ان میں سے کوئی حادثہ بھی اُن کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ بلکہ اُن کے مٹنے کی صرف ایک وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے مادی سہاروں کو تلاش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جونہی یہ فانی سہارے ذرا کمزور ہوئے اسی وقت ان قوموں کے اندر بھی اضمحلال پیدا ہوا اور زمانے نے انہیں بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔ لیکن اسلامی قافلہ کی چونکہ ساری متاع اطاعتِ الٰہی کا ایک غیر فانی جذبہ اور اعلانِ حق کا ایک لازوال عزم تھا اس لیے حفاظت و پاسبانی کے مادی ذرائع سے یکسر محروم رہ کر بھی یہ ملت زندہ رہی اور ہر قسم کی مخالفت اور مخاصمت کا پوری قوت اور جرأت مندی سے مقابلہ کرتی رہی۔

اسلام چند ملاؤں کے وعظوں کا ظہور نہیں بلکہ ایک زبردست تاریخی قوت ہے جسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نیم بر اعظم میں مسلم قوم کے اندر جب کبھی بھی فکر و عمل کی کوئی حرکت پیدا ہوئی تو اس کے پیچھے یہی ایک چبھتا ہوا احساس ہی کار فرما تھا کہ مسلمانوں کو جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ اب وہ نہیں رہے ہیں۔ اسلام کے اصولوں پر ان کا معاشرہ استوار نہیں ہے اور ان کا نظامِ زندگی وہ نہیں ہے جس کا نقشہ قرآن اور سنتِ نبوی نے پیش کیا تھا۔ مسلمان کہلاتے ہوئے اسلام سے منحرف ہو کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا نمایاں تضاد ہے جسے دُور کرنے کی انہیں جلد از جلد کوشش کرنی چاہیے۔ ان احساسات نے ہی مل جُل کر اس ملت کے اندر وہ بے چینی پیدا کی جس سے اسلامی انقلاب کے سوتے پھوٹے اور یہاں دین حق کی سربلندی کے لیے مختلف تحریکات نے سر اٹھایا۔ بے چینی کے یہ احساسات بڑے گہرے ہیں اور ہمارے معاشرے کے ذہنی پس منظر کی واضح انداز سے عکاسی کرتے ہیں۔ ان احساسات کو نہ تو اپنوں کی ملوکیت اور جباری مٹا سکی اور نہ غیر ملکی طاقتوں کی قاہری اور سحری اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ان مقدس احساسات کو ہمارے دینی پس منظر نے جنم دیا ہے اور ان کی آبیاری بڑے بڑے آئمہ و صلحاء نے اپنی قربانیوں سے کی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی جدوجہد ایسی ہوگی جس کے اندر یہ احساساتِ دل بن کر نہ دھڑکے ہوں گے۔ مجدد الف ثانی کی اقتدار سے ٹکر، شاہ ولی اللہ اور اُن کے عظیم الشان خاندان کی دینی سرگرمیاں، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جاں نثار رفقاء کار کی شہادت سب انہی "پاکیزہ احساسات" کے مختلف مظاہر ہیں۔ اور تو اور خود تحریکِ پاکستان کی گرماگرمی انہی جذبات کی وجہ سے تھی اور اسلامی نظام کی پکار ہی میں وہ کشش تھی جس نے جمود زدہ مسلمانوں کے خون کو گرم اور ارادوں کو جوان کر دیا اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔

جس دین کے ساتھ ایک قوم کا رشتہ اتنا گہرا اور مضبوط ہو اور جس کی جڑیں اُس کی زندگی کی

گہرائیوں میں اتر چکی ہوں۔ کیا کبھی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ قوم محض ایک مختصر سے طبقے کی خواہش کے احترام میں قوت و طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے دست کش ہو جائے۔

ملت کا ایک ایک فرد اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے کہ پاکستان نہ تو کوئی جغرافیائی وحدت ہے اور نہ ہی لسانی اور نسلی وحدت۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ حائل ہے۔ یہاں مختلف نسلیں آباد ہیں اور لوگ متعدد زبانیں بولتے ہیں سوائے اسلام کے ایک مضبوط رشتہ کے ان کے درمیان کوئی ایسا رشتہ موجود نہیں جو ان کے مائل بہ انتشار اجزاء کو جوڑ کر انہیں ایک ملت بنا سکے۔

پھر یہاں کے لوگوں کی عظیم اکثریت اپنے تاریخی پس منظر میں اسلامی روایات کے علاوہ کوئی دوسری روایات نہیں رکھتی جن کے لیے اُس کے دل میں عزت و احترام کے جذبات پیدا کیے جا سکیں اور اس طرح اسے اسلامی تہذیب و تمدن کی بجائے کسی دوسری تہذیب کا علمبردار بنا کر دنیا میں زندہ رکھا جا سکے۔ کیا کسی شخص کی عقل کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتی ہے کہ پاکستان کو اسلامی تمدن کا مولد و مسکن بنانے کی بجائے یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ اسے قدیم ہند و تہذیب، یا مغربی تہذیب کا پرستار بنانے میں کامیاب ہو سکے گا جس ملک کی بنیاد ہی غیر اسلامی اقدارِ حیات سے بغاوت پر رکھی گئی ہو اور جس کے حصول کا واحد مقصد اسلام کے روشن دور تہذیب کا احیاء ہو، اور اسی ایک مقصد کی خاطر دنیا کا ہر نقصان برداشت کیا گیا ہو۔ اسے برباد تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے کبھی کفر و الحاد کی کمیں گاہ نہیں بنایا جا سکتا۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ پوری قوم اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو، اپنے عزائم اور ارادوں کو محض ایک مختصر سے طبقے کی خواہش پر قربان کر دے اور اپنے اس وعدے کی تکذیب کرنے پر آمادہ ہو جائے جو اس نے خالق و مخلوق کے ساتھ پوری کائنات کو گواہ بنا کر کیا تھا۔ ملت پر بلاشبہ انحطاط طاری ہو چکا ہے لیکن وہ ابھی تک پاگل نہیں ہوئی کہ اس قسم کی حماقتیں کرنے لگے۔ جو لوگ ملت کے بارے میں اس قسم کے نظریات رکھتے ہیں انہیں اپنے جائزے کی غلطی کا کافی حد تک اندازہ ہو چکا ہوگا

جو لوگ اسلامی نظام کے قیام کی تحریک کو ملاؤں کی تحریک سمجھ کر اسے اڑانے کی، یا اسے ہوائی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنے کی حماقت کرتے ہیں، وہ ملک و ملت کے کبھی بھی خیر خواہ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ایک ایسی تاریخی قوت سے متصادم ہو رہے ہیں جو اس قوم کی طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کچھ دیر پولیس اور فوج کی مدد سے اس نظام کا راستہ روکنے میں بظاہر کامیاب ہو جائیں لیکن انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قوم کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کو کبھی مستقل طور پر کچلا نہیں جا سکتا۔ انہیں جتنی شدت سے دبانے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی ان کے اندر قوت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ ان حضرات کو آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے اور تاریخ کے اوراق الٹ کر اُن لوگوں کا انجام معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جنہوں نے ماضی میں اسی قسم کی احمقانہ حرکات کی ہیں۔ ذرا جائیے اور اپنے ملک کے بادشاہ "اکبر" کے کارناموں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیجیے۔ آپ پر حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی۔

یہ سطور ابھی سپرد قلم کی جا رہی تھیں کہ ہماری نگاہ مغربی پاکستان کی وزیر تعلیم بیگم محمودہ سلیم کے اُس بیان پر پڑی جو انہوں نے حال ہی میں تعلیمی اداروں کی ثقافتی سرگرمیوں کے متعلق ایک اخباری نمائندہ کو دیا ہے۔ یہ بیان انتہائی افسوسناک ہے۔ اور برسر اقتدار طبقے کے ذہنی بگاڑ کی بہر اعتبار سے ترجمانی کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کی زمام کار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے اُن کا یہاں کے باشندوں سے سوائے رنگ و نسل کے اشتراک کے اور کوئی رشتہ نہیں۔ اسی لیے وہ ان کے احساسات و جذبات کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں

اس بیان کا پس منظر یہ ہے کہ اس ملک کی عظیم اکثریت برسوں سے اُن "ثقافتی سرگرمیوں" کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہے جنہیں ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت سکولوں اور کالجوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ ثقافتی سرگرمیاں درحقیقت فحاشی اور بے حیائی کو پروان چڑھانے میں براہ راست ممد اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے نوجوان بچوں اور بچیوں کے

تفہیم القرآن

یٰسٓ

(۳)

[26]اِن لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے[27]۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے، تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے[28]۔ پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے[29]؟ پاک ہے وہ ذات[30] جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ

---

۲۶ پچھلے دو رکوعوں میں کفارِ مکہ کو انکار و تکذیب اور مخالفتِ حق کے اُس رویہ پر ملامت کی گئی تھی جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔ اب تقریر کا رخ اُس بنیادی نزاع کی طرف پھرتا ہے جو اُن کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش کی اصل وجہ تھی، یعنی توحید و آخرت کا عقیدہ، جسے حضور پیش کر رہے تھے اور کفار ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پے در پے چند دلائل دے کر لوگوں کو دعوتِ غور و فکر دی جا رہی ہے کہ دیکھو، کائنات کے یہ آثار جو علانیہ تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا اُس حقیقت کی صاف صاف نشان دہی نہیں کرتے جسے یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

۲۷ یعنی اس امر کی نشانی کہ توحید ہی حق ہے اور شرک سراسر بے بنیاد ہے۔

۲۸ اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "تاکہ یہ کھائیں اُس کے پھل اور وہ چیزیں جو ان کے اپنے ہاتھ بناتے ہیں"۔ یعنی وہ مصنوعی غذائیں جو قدرتی پیداوار سے یہ لوگ خود تیار کرتے ہیں، مثلاً روٹی، سالن، مربے، اچار، چٹنیاں اور بے شمار دوسری چیزیں۔

۲۹ ان مختصر فقروں میں زمین کی روئیدگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ آدمی شب و روز اس زمین کی

پیداوار کھا رہا ہے اور اپنے نزدیک اِسے ایک معمولی بات سمجھتا ہے۔ لیکن اگر وہ غفلت کا پردہ چاک کر کے نگاہ غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ اس فرشِ خاک سے لہلہاتی کھیتیوں اور سرسبز باغوں کا اُگنا اور اس کے اندر چشموں اور نہروں کا رواں ہونا کوئی کھیل نہیں ہے جو آپ سے آپ ہوئے جا رہا ہو بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت و قدرت اور ربوبیت کارفرما ہے۔ زمین کی حقیقت پر غور کیجیے۔ جن مادّوں سے یہ مرکب ہے اُن کے اندر بجائے خود کسی نشو و نما کی طاقت نہیں ہے۔ یہ سب مادّے فرداً فرداً بھی اور ہر ترکیب و آمیزش کے بعد بھی بالکل غیر نامی ہیں اور اس بنا پر ان کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان زمین کے اندر سے نباتی زندگی کا ظہور آخر کیسے ممکن ہوا؟ اس کی تحقیق آپ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ چند بڑے بڑے اسباب ہیں جو اگر پہلے فراہم نہ کر دیئے گئے ہوتے تو یہ زندگی سرے سے وجود میں نہ آسکتی تھی۔

اوّلاً، زمین کے مخصوص خطوں میں اس کی اوپری سطح پر بہت سے ایسے مادّوں کی تہ چڑھائی گئی جو نباتات کی غذا بننے کے لیے موزوں ہو سکتے تھے اور اس تہ کو نرم رکھا گیا تاکہ نباتات کی جڑیں اس میں پھیل کر اپنی غذا چوس سکیں۔

ثانیاً، زمین پر مختلف طریقوں سے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تاکہ غذائی مادے اس میں تحلیل ہو کر اس قابل ہو جائیں کہ نباتات کی جڑیں ان کو جذب کر سکیں۔

ثالثاً، اوپر کی فضا میں ہوا پیدا کی گئی جو آفاتِ سماوی سے زمین کی حفاظت کرتی ہے، جو بارش لانے کا ذریعہ بنتی ہے، اور اپنے اندر وہ گیسیں بھی رکھتی ہے جو نباتات کی زندگی اور ان کے نشو و نما کے لیے درکار ہیں۔

رابعاً، سورج اور زمین کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا کہ نباتات کو مناسب درجۂ حرارت اور موزوں موسم مل سکیں۔

یہ چار بڑے بڑے اسباب (جو بجائے خود بے شمار ضمنی اسباب کا مجموعہ ہیں) جب پیدا کر دیئے گئے تب نباتات کا وجود میں آنا ممکن ہوا۔ پھر یہ سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد نباتات پیدا کیے گئے اور ان میں سے ہر ایک کا تخم ایسا بنایا گیا کہ جب اسے مناسب زمین، پانی، ہوا اور موسم میسر آئے تو اس کے

زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا اُن اشیاء میں سے

اندر نباتی زندگی کی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ مزید براں اسی تخم میں یہ انتظام بھی کر دیا گیا کہ ہر نوع کے تخم سے لازماً اسی نوع کا پودا اپنی تمام نوعی اور موروثی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہو۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید کاری گری یہ کی گئی کہ نباتات کی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بے حد وحساب قسمیں پیدا کی گئیں اور ان کو اس طرح بنایا گیا کہ وہ اُن بے شمار اقسام کے حیوانات اور بنی آدم کی غذا، دوا، لباس اور اَن گنت دوسری ضرورتوں کو پورا کر سکیں جنہیں نباتات کے بعد زمین پر وجود میں لایا جانے والا تھا۔

اس حیرت انگیز انتظام پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اگر ہٹ دھرمی اور تعصب میں مبتلا نہیں ہے تو اس کا دل گواہی دیگا کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس میں صریح طور پر ایک حکیمانہ منصوبہ کام کر رہا ہے جس کے تحت زمین، پانی، ہوا اور موسم کی مناسبتیں نباتات کے ساتھ، اور نباتات کی مناسبتیں حیوانات اور انسانوں کی حاجات کے ساتھ انتہائی نزاکتوں اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہیں۔ کوئی ہوشمند انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی ہمہ گیر مناسبتیں محض اتفاقی حادثہ کے طور پر قائم ہو سکتی ہیں۔ پھر یہی انتظام اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ بہت سے خداؤں کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک ہی ایسے خدا کا انتظام ہے اور ہو سکتا ہے جو زمین، ہوا، پانی، سورج، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی، سب کا خالق و رب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے خدا الگ الگ ہوتے تو آخر کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور گہری حکیمانہ مناسبتیں رکھنے والا منصوبہ بن جاتا اور لاکھوں کروڑوں برس تک اتنی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہتا۔

توحید کے حق میں یہ استدلال پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ؟ یعنی کیا یہ لوگ ایسے احسان فراموش اور نمک حرام ہیں کہ جس خدا نے یہ سب کچھ سروسامان ان کی زندگی کے لیے فراہم کیا ہے، اس کے یہ شکر گزار نہیں ہوتے اور اس کی نعمتیں کھا کھا کر دوسروں کے شکریے ادا کرتے ہیں؟ اس کے آگے نہیں جھکتے اور ان جھوٹے معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنہوں نے ایک تنکا بھی اِن کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟

ننلہ یعنی ہر شائبۂ نقص و عیب سے پاک، ہر غلطی اور کمزوری سے پاک، اور اس بات سے پاک کہ کوئی

جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔[۳۱]

اس کا شریک و سہیم ہو۔ مشرکین کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے بالعموم قرآن مجید میں یہ الفاظ اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ شرک کا ہر عقیدہ اپنی حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر کسی نہ کسی نقص اور کسی نہ کسی کمزوری اور عیب کا الزام ہے۔ اللہ کے لیے شریک تجویز کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسی بات کہنے والا دراصل یہ سمجھتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ تنہا اپنی خدائی کا کام چلانے کے قابل نہیں ہے، یا وہ مجبور ہے کہ اپنی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کرے، یا کچھ دوسری ہستیاں آپ سے آپ ایسی طاقت ور ہیں کہ وہ خدائی کے نظام میں دخل دے رہی ہیں اور خدا ان کی مداخلت برداشت کر رہا ہے، یا معاذاللہ وہ انسانی بادشاہوں کی سی کمزوریاں رکھتا ہے جن کی بنا پر وزیروں، درباریوں، منہ چڑھے مصاحبوں، اور چہیتے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک لشکر اسے گھیرے ہوئے ہے اور خدائی کے بہت سے اختیارات ان کے درمیان بٹ کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ جاہلانہ تصورات اگر ذہنوں میں موجود نہ ہوتے تو سرے سے شرک کا خیال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک اور منزہ ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

[۳۱] یہ توحید کے حق میں ایک اور استدلال ہے۔ اور یہاں پھر پیش پا افتادہ حقائق ہی میں سے بعض کو لے کر بتایا جا رہا ہے کہ شب و روز جن اشیاء کا تم مشاہدہ کرتے اور یونہی غور و خوض کیے بغیر گزر جاتے ہو انہی کے اندر حقیقت کا سُراغ دینے والے نشانات موجود ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑ تو خود انسان کا اپنا سببِ پیدائش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادہ کے ازدواج سے چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ اُن میں تزویج کا اصول کام کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ بے جان مادّوں تک میں مختلف اشیاء جب ایک دوسرے سے جوڑ کھاتی ہیں تب کہیں اُن سے طرح طرح کے مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ خود مادے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے ارتباط سے ہوئی ہے۔ یہ تزویج، جس کی بدولت یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے، حکمت و صناعی کی ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں رکھتی ہے اور اس کے اندر ہر دو زوجین کے درمیان ایسی مناسبتیں پائی جاتی ہیں کہ بے لاگ عقل رکھنے والا کوئی شخص نہ تو اس چیز کو ایک

اِن کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اُس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو اِن پر اندھیرا چھا جاتا ہے[۳۲]۔ اور سُورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے[۳۳]۔ یہ زبردست علیم

اتفاقی حادثہ کہہ سکتا ہے اور نہ یہ مان سکتا ہے کہ مختلف خداؤں نے اِن بے شمار ازواج کو پیدا کر کے ان کے درمیان اس حکمت کے ساتھ جوڑ لگائے ہوں گے۔ ازواج کا ایک دوسرے کے لیے جوڑ ہونا اور ان کے اِزدواج سے نئی چیزوں کا پیدا ہونا خود وحدتِ خالق کی صریح دلیل ہے۔

۳۲؎ رات اور دن کی آمد و رفت بھی انہی پیش پا افتادہ حقائق میں سے ہے جنہیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آ رہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے، اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک ربِّ قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جا سکتا اور رات کبھی نہیں آسکتی جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ ہٹے۔ دن کے ہٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطہ نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات اور دن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے ہٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصہ پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصے پر ہمیشہ دن رہتا، یا شب و روز کا اُلٹ پھیر بہت تیز یا بہت سُست ہوتا، یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن نکل آتا اور کبھی رات چھا جاتی، تو ان تمام صورتوں میں اس کرّے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی، بلکہ غیر زندہ مادّوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کارفرمائی صاف دیکھ سکتا ہے جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں

ہستی کا باندھا ہُوا حساب ہے۔ اور چاند، اُس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہُوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے [۳۳]۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو

اس نے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں۔ خدا کا وجود اور اس کی توحید اگر کسی شخص کے نزدیک بعید از عقل ہے تو وہ خود ہی سوچ کر بتائے کہ اس کاریگری کو بہت سے خداؤں کی طرف منسوب کرنا، یا یہ سمجھنا کہ کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت کے تحت یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے کس قدر عقل سے بعید ہونا چاہیے۔ کسی ثبوت کے بغیر محض قیاس و گمان کی بنیاد پر جو شخص یہ دوسری سراسر نامعقول توجیہات مان سکتا ہے وہ جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں نظم اور حکمت اور مقصدیت کا پایا جانا خدا کے ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ شخص کسی نظریے یا عقیدے کو قبول کرنے کے لیے کسی درجے میں بھی، کافی یا ناکافی، عقلی ثبوت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

[۳۲] ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں جا کر سورج کو آخر کار ٹھیر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اسی وقت متعین کر سکتا ہے جبکہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا بھی ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے اور نظامِ شمسی کے سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہُوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتہ چلا کہ نہ صرف سورج، بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (FIXED STARS) کہا جاتا ہے، ایک رُخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے کر ۱۰۰ میل فی سکنڈ تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانہ کے ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کیلو میٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، لفظ "اسٹار" اور لفظ "سن")۔

[۳۳] یعنی مہینے کے دوران میں چاند کی گردش ہر روز بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن وہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے

جا پکڑے ۳۵ اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے ۳۶ ۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں ۳۷ ۔

پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد روز گھٹتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ آخر کار پھر اپنی ابتدائی ہلالی شکل پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ یہ چکر لاکھوں برس سے پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند کی ان مقرر منزلوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے انسان حساب لگا کر ہمیشہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ اگر اس کی حرکت کسی ضابطہ کی پابند نہ ہوتی تو یہ حساب لگانا ممکن نہ ہوتا۔

۳۵ ۔ اس فقرے کے دو مطلب لیے جا سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ سورج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ چاند کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، یا خود اس کے مدار میں داخل ہو کر اس سے جا ٹکرائے۔ دوسرا یہ کہ جو اوقات چاند کے طلوع و ظہور کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان میں سورج کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور یکایک سورج افق پر آ جائے۔

۳۶ ۔ یعنی ایسا بھی کبھی نہیں ہوتا کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے رات آ جائے اور جو اوقات دن کی روشنی کے لیے مقرر ہیں ان میں وہ اپنی تاریکیاں لیے ہوئے یکایک آ موجود ہو۔

۳۷ ۔ فَلَک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (ORBIT) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سماء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ پھر یہ ارشاد کہ "سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں"، چار حقیقتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیارے اور اجرام فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

ان آیات کا اصل مقصد علمِ ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لیکر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد و حساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور

اِن کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے اِن کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا،۴۸ اور پھر

شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز، سورج زمین سے ۳ لاکھ گنا بڑا ہے، اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۷۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظامِ شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (GALAXY) میں ہمارا یہ نظامِ شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (۳ ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں، اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰ لاکھ لولبی سحابیوں (SPIRAL NEBULAE) میں سے ایک ہے، اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰ کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائعِ مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق بہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم اسی مادے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کارفرما ہے، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دور دراز کی دنیاؤں کے مشاہدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرمانروا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم، جو حکمت، جو صناعی، اور جو مناسبت اِن لاکھوں کہکشانوں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیاروں میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحبِ عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو گیا ہے؟ اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع، اور اس مناسبت کے

اِن کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔[۴۰] ہم چاہیں تو اِن کو غرق کر دیں، کوئی اِن کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقتِ خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دیتی ہے۔[۴۱]

پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے!

۳۹۔ بھری ہوئی کشتی سے مراد ہے حضرت نوحؑ کی کشتی۔ اور نسلِ انسانی کو اُس پر سوار کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کشتی میں بظاہر تو حضرت نوحؑ کے چند ساتھی ہی بیٹھے ہوئے تھے مگر درحقیقت قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس پر سوار تھے۔ کیونکہ طوفانِ نوحؑ میں ان کے سوا باقی پوری اولادِ آدم کو غرق کر دیا گیا تھا اور بعد کی انسانی نسل صرف انہی کشتی والوں سے چلی۔

۴۰۔ اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تاریخ میں پہلی کشتی جو بنی وہ حضرت نوحؑ والی کشتی تھی۔ اُس سے پہلے انسان کو دریاؤں اور سمندروں کے عبور کرنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ اِس طریقے کی تعلیم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو دی۔ اور جب اُن کی بنائی ہوئی کشتی پر سوار ہو کر اللہ کے کچھ بندے طوفان سے بچ نکلے تو آئندہ ان کی نسل نے بحری سفروں کے لیے کشتیاں بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۴۱۔ پچھلی نشانیوں کا ذکر دلائلِ توحید کی حیثیت سے کیا گیا تھا، اور اِس نشانی کا ذکر یہ احساس دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر تصرف کے جو اختیارات بھی حاصل ہیں وہ اللہ کے دیئے ہوئے ہیں، اُس کے اپنے حاصل کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ان طاقتوں پر تصرف کے جو طریقے اس نے دریافت کیے ہیں وہ بھی اللہ کی رہنمائی سے اس کے علم میں آئے ہیں، اس کے اپنے معلوم کیے ہوئے نہیں ہیں۔ انسان کا اپنا بل بوتا یہ نہ تھا کہ اپنے زور سے وہ اِن عظیم طاقتوں کو مسخر کرتا اور نہ اس میں یہ صلاحیت تھی کہ خود اسرارِ فطرت کا پتہ چلا لیتا اور ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکتا۔ پھر جن قوتوں پر بھی اللہ نے اس کو اقتدار عطا کیا ہے اُن پر اس کا قابو اسی وقت تک چلتا ہے جب تک اللہ کی مرضی یہ ہوتی ہے کہ وہ اُس کے لیے مسخر رہیں۔ ورنہ جب مرضیِ الٰہی کچھ اور ہوتی ہے تو وہی طاقتیں جو انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، اچانک اس پر پلٹ پڑتی ہیں اور آدمی اپنے آپ کو ان کے سامنے بالکل

اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اُس انجام سے جو تمہارے آگے آ رہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے[۴۱]، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں)۔ اِن کے سامنے اِن کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے[۴۲]۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے اُس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو تو یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں "کیا ہم اُن کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو[۴۳]"

[۴۴] یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو[۴۵]" دراصل

بے بس پاتا ہے۔ اِس حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بحری سفر کے معاملہ کو محض بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ نوعِ انسانی پوری کی پوری طوفان میں ختم ہو جاتی اگر اللہ تعالیٰ کشتی بنانے کا طریقہ حضرت نوحؑ کو نہ سمجھا دیتا اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ اس میں سوار نہ ہو جاتے۔ پھر نوعِ انسانی کے لیے تمام روئے زمین پر پھیلنا اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اللہ سے کشتی سازی کے اصولوں کا علم پا کر لوگ دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرنے کے لائق ہو گئے تھے۔ مگر اُس ابتدا سے چل کر آج کے عظیم الشان جہازوں کی تعمیر تک انسان نے جتنی کچھ ترقی کی ہے اور جہاز رانی کے فن میں جتنا کچھ بھی کمال حاصل کیا ہے اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دریا اور سمندر، سب اس کے قابو میں آ گئے ہیں اور ان پر اسے مکمل غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ آج بھی خدا کا پانی خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور جب وہ چاہتا ہے انسان کو اُس کے جہازوں سمیت اس میں غرق کر دیتا ہے۔

[۴۱] یعنی جو تم سے پہلے کی قومیں دیکھ چکی ہیں۔

[۴۲] آیات سے مراد کتاب اللہ کی آیات بھی ہیں جن کے ذریعہ سے انسانوں کو نصیحت کی جاتی ہے اور وہ آیات بھی مراد ہیں جو آثارِ کائنات اور خود انسان کے وجود اور اس کی تاریخ میں موجود ہیں جو انسان کو عبرت دلاتی ہیں بشرطیکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو۔

[۴۳] اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کفر نے صرف ان کی عقل ہی اندھی نہیں کی ہے بلکہ ان کی اخلاقی حس کو بھی مردہ کر دیا ہے۔ وہ نہ خدا کے بارے میں صحیح تفکر سے کام لیتے ہیں، نہ خلق کے ساتھ صحیح طرزِ عمل

یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اُس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہونگے، اور اُس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے، نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے۵۰ پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۵۱ گھبرا کر کہیں گے: ۵۲ ارے، یہ ع ۳

اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہر نصیحت کا اُلٹا جواب ہے۔ ہر گمراہی اور بداخلاقی کے لیے ایک اوندھا فلسفہ ہے۔ ہر بھلائی سے فرار کے لیے ایک گھڑا گھڑایا بہانا موجود ہے۔

۴۴ توحید کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے درمیان نزاع برپا تھی وہ آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے متعلق عقلی دلائل تو آگے چل کر خاتمۂ کلام پر دیئے گئے ہیں مگر دلائل دینے سے پہلے یہاں اس مسئلے کو لے کر عالمِ آخرت کا ایک عبرتناک نقشہ اُن کے سامنے کھینچا گیا ہے تاکہ انہیں یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ انکار کر رہے ہیں وہ ان کے انکار سے ٹلنے والی نہیں ہے بلکہ لامحالہ ایک روز ان حالات سے انہیں دوچار ہونا ہے۔

۴۵ اس سوال کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ لوگ فی الواقع قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اگر مثلاً ان کو یہ بتا دیا جاتا کہ وہ فلاں سنہ میں فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو پیش آئیگی تو ان کا شک رفع ہو جاتا اور وہ اسے مان لیتے۔ دراصل اس طرح کے سوالات وہ محض کج بحثی کے لیے چیلنج کے انداز میں کرتے تھے اور اُن کا مدعا یہ کہنا تھا کہ کوئی قیامت ویامت نہیں آنی ہے، تم خواہ مخواہ ہمیں اس کے ڈراوے دیتے ہو۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ قیامت فلاں روز آئے گی، بلکہ انہیں یہ بتایا گیا کہ وہ آئے گی اور اِس شان سے آئے گی۔

۴۶ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ قیامت آہستہ آہستہ آ رہی ہے اور لوگ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آ رہی ہے۔ بلکہ وہ اس طرح آئے گی کہ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کے کاروبار چلا رہے ہیں اور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ تصور موجود نہیں ہے کہ دنیا کے خاتمہ کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اس حالت میں اچانک ایک زور کا کڑاکا ہوگا اور جو جہاں تھا وہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟۴۸ یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی۔۴۹ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے حاضر

حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ راستوں پر چل رہے ہونگے، بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہونگے، اپنی مجلسوں میں بیٹھے گفتگوئیں کر رہے ہونگے۔ ایسے میں یکایک صور پھونکا جائے گا۔ کوئی کپڑا خرید رہا تھا تو ہاتھ سے کپڑا رکھنے کی نوبت نہ آئے گی کہ ختم ہو جائے گا۔ کوئی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے حوض بھرے گا اور ابھی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ کوئی کھانا کھانے بیٹھے گا اور لقمہ اٹھا کر منہ تک لے جانے کی بھی اسے مہلت نہ ملے گی۔

۴۷ صور کے متعلق تفصیلی کلام کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۱۲۲۔ پہلے صور اور دوسرے صور کے درمیان کتنا زمانہ ہوگا، اس کے متعلق کوئی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زمانہ سینکڑوں اور ہزاروں برس طویل ہو۔ حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اسرافیل صور پر منہ رکھے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پھونک مارنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخۃ الفزع، جو زمین و آسمان کی ساری مخلوق کو سہما دیگا۔ دوسرا نفخۃ الصعق جسے سنتے ہی سب ہلاک ہو کر گر جائیں گے۔ پھر جب اللہ واحد صمد کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا تو زمین بدل کر کچھ سے کچھ کر دی جائے گی اور اسے عکاظی بساط کی طرح ایسا سپاٹ کر دیا جائے گا کہ اس میں کوئی ذرا سی سلوٹ تک نہ رہے گی۔ پھر اللہ اپنی خلق کو بس ایک جھڑکی دیگا جسے سنتے ہی ہر شخص جس جگہ مر کر گرا تھا اسی جگہ وہ اس بدلی ہوئی زمین پر اٹھ کھڑا ہوگا، اور یہی نفخۃ القیام لرب العالمین ہے۔ اسی مضمون کی تائید قرآن مجید کے بھی متعدد اشارات سے ہوتی ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۹۲-۴۹۳۔ جلد سوم، ص ۱۲۴-۱۲۵۔

۴۸ یعنی اس وقت انہیں یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ مر چکے تھے اور اب ایک مدت دراز کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گئے ہیں، بلکہ وہ اس خیال میں ہونگے کہ ہم سوئے پڑے تھے، اب یکایک کسی خوفناک حادثہ کی وجہ سے ہم جاگ اٹھے ہیں اور بھاگے جا رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم ص ۱۲۳-۱۹۹-۲۰۰)

کر دیئے جائیں گے"۔ آج کسی پر[۵۰] ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے عمل تم کرتے رہے تھے ۔۔۔ آج جنتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں[۵۱]، وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں اُن کے لیے حاضر ہے، رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے۔ اور اے مجرمو آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ[۵۲]۔ آدم کے بچو، کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو،

۴۹ھ یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ جواب دینے والا کون ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر بعد خود انہی لوگوں کی سمجھ میں معاملہ کی اصل حقیقت آجائے اور وہ آپ ہی اپنے دلوں میں کہیں کہ ہائے ہماری کم بختی، یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر خدا کے رسول ہمیں دیتے تھے اور ہم اسے جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہلِ ایمان ان کی غلط فہمی رفع کریں اور ان کو بتائیں کہ یہ خواب سے بیداری نہیں بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جواب قیامت کا پورا ماحول ان کو دے رہا ہو، یا فرشتے ان کو حقیقتِ حال سے مطلع کریں۔

۵۰ھ یہ وہ خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین اور فساق و مجرمین سے اُس وقت فرمائے گا جب وہ اُس کے سامنے حاضر کیے جائیں گے۔

۵۱ھ اس کلام کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صالح اہلِ ایمان میدانِ حشر میں روک کر نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ابتدا ہی میں ان کو بلا حساب، یا ہلکی حساب فہمی کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا، کیونکہ ان کا ریکارڈ صاف ہو گا۔ انہیں دورانِ عدالت انتظار کی تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں جوابدہی کرنے والے مجرموں کو بتائے گا کہ دیکھو، جن صالح لوگوں کو تم دنیا میں بے وقوف سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے، وہ اپنی عقلمندی کی بدولت آج جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور تم جو اپنے آپ کو بڑا زیرک و فرزانہ سمجھ رہے تھے، یہاں کھڑے اپنے جرائم کی جوابدہی کر رہے ہو۔

۵۲ھ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مومنین صالحین سے الگ ہو جاؤ، کیونکہ دنیا میں چاہے تم ان کی قوم اور ان کے کنبے اور برادری کے لوگ رہے ہو، مگر یہاں اب تمہارا اور ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں ہے۔

وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے[۵۳]؟ مگر اس کے باوجود اس نے اور دوسرا یہ کہ تم آپس میں الگ الگ ہو جاؤ۔ اب تمہارا کوئی جتھا قائم نہیں رہ سکتا۔ تمہاری سب پارٹیاں توڑ دی گئیں۔ تمہارے تمام رشتے اور تعلقات کاٹ دیئے گئے۔ تم میں سے ایک ایک شخص کو اب تنہا اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۵۳ یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے "عبادت" کو اطاعت کے معنی میں استعمال فرمایا ہے ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن میں متعدد مقامات پر اس مضمون کی تشریح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو جلد اول، صفحات ۱۴۴ - ۳۹۸ - ۵۷۷ - ۵۷۸ - ۵۸۶ جلد دوم، صفحات ۱۰۹ - ۸۱۴ - ۴۸۳ - جلد سوم، صفحات ۳۱ - ۶۹ - ۶۵۶ - اور حواشی سورۂ سبا، آیات ۴۰، ۴۱) اس سلسلہ میں وہ نفیس بحث بھی قابلِ ملاحظہ ہے جو اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "لا تعبدوا الشیطان کے معنی ہیں لا تطیعوہ (اس کی اطاعت نہ کرو)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو محض سجدہ کرنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت کرنا اور اس کے حکم کی تابعداری کرنا بھی ممنوع ہے۔ لہٰذا اطاعت عبادت ہے۔" اس کے بعد امام صاحب سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر عبادت بمعنی طاعت ہے تو کیا آیت أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ میں ہم کو رسول اور امراء کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ: "ان کی اطاعت جبکہ اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت اور اسی کی طاعت ہوگی۔ یہی نہیں، بلکہ خود رکوع و سجود بھی اگر غیر کے سامنے اللہ کے حکم سے ہو تو وہ اللہ ہی کی عبادت ہوگی۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ملائکہ نے اللہ کے حکم سے آدم کو سجدہ کیا اور یہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ تھی۔ امراء کی طاعت ان کی عبادت صرف اس صورت میں ہوگی جبکہ ایسے معاملات میں ان کی اطاعت کی جائے جن میں اللہ نے ان کی اطاعت کا اذن نہیں دیا ہے۔" پھر فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص تمہارے سامنے آئے اور تمہیں کسی چیز کا حکم دے تو دیکھو کہ اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں۔ موافق نہ ہو تو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے، اگر اس حالت میں تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے ساتھ شیطان کی عبادت کی۔ اسی طرح اگر تمہارا نفس تمہیں کسی کام کے کرنے پر اکسائے تو دیکھو کہ شرع کی رُو سے وہ کام کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اجازت نہ ہو تو تمہارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ

تم میں سے ایک گروہِ کثیر کو گمراہ کر دیا کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۵۴؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا۔ جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اُس کی پاداش میں اب اِس کا ایندھن بنو"۔ آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں، اِن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دینگے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۵۵۔

ہے۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تم اس کی عبادت کے مرتکب ہوئے" آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں: "مگر شیطان کی عبادت کے مراتب مختلف ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضاء کے ساتھ اس کی زبان بھی اس کی موافقت کرتی ہے اور دل بھی اس میں شریک ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعضاء و جوارح سے تو آدمی ایک کام کرتا ہے مگر دل اور زبان اس کام میں شریک نہیں ہوتے بعض لوگ ایک گناہ کا ارتکاب اس حال میں کرتے ہیں کہ دل اُن کا اس پر راضی نہیں ہوتا اور زبان ان کی اللہ سے مغفرت کر رہی ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم برا کام کر رہے ہیں۔ یہ محض ظاہری اعضاء سے شیطان کی عبادت ہے۔ کچھ اور لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ٹھنڈے دل سے جرم کرتے ہیں اور زبان سے بھی اپنے اس فعل پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرتے ہیں . . . . . یہ ظاہر و باطن دونوں میں شیطان کے عابد ہیں"۔ (تفسیر کبیر۔ ج ۷۔ ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵۴ یعنی اگر تم عقل سے محروم رکھے گئے ہوتے اور پھر اپنے رب کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی بندگی کرتے تو تمہارے لیے عذر کی کوئی گنجائش تھی۔ لیکن تمہارے پاس تو خدا کی دی ہوئی عقل موجود تھی جس سے تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے تھے۔ اور تمہیں خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے متنبہ بھی کر دیا تھا۔ اس پر بھی جب تم اپنے دشمن کے فریب میں آئے اور وہ تمہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اپنی اس حماقت کی ذمہ داری سے تم کسی طرح بری نہیں ہو سکتے۔

۵۵ یہ حکم اُن ہیکڑ مجرموں کے معاملہ میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں کو بھی جھٹلا دینگے، اور نامۂ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ حکم دیگا کہ اچھا، اپنی بکواس بند کرو اور دیکھو کہ تمہارے اپنے اعضائے بدن تمہارے کرتوتوں کی کیا روداد سناتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں

صرف ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کا ذکر فرمایا گیا ہے مگر دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں اور ان کے جسم کی کھالیں بھی پوری داستان سنا دیں گی کہ وہ ان سے کیا کام لیتے رہے ہیں۔ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النور۔ آیت ۲۴)۔ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (حٰمٓ السجدہ۔ آیت ۲۰)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سورۂ نور کی آیت میں فرماتا ہے کہ ان کی زبانیں گواہی دیں گی، ان دونوں باتوں میں تطابق کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مراد ان کا اختیارِ کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ ان کی زبانیں خود یہ داستان سنانا شروع کر دیں گی کہ ہم سے ان ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کفر بکے تھے، کیا کیا جھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے، اور کس کس موقع پر انہوں نے ہمارے ذریعہ سے کیا باتیں کی تھیں۔

قارئینِ "تفہیم القرآن" توجہ فرمائیں

تفہیم القرآن جلد سوم کی اشاعت کے بعد اس کے قارئین کی جانب سے بالعموم ایک شکایت ناشر اور مؤلف کے نام آ رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ صفحہ ۲۸۶ پر أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ (آیت نمبر ۶۱) کا ترجمہ کتابت سے رہ گیا ہے۔ یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ اس آیت کا ترجمہ صفحہ ۲۸۴-۲۸۵ پر ان الفاظ میں موجود ہے "بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے انہیں پا لینے والے تو وہ لوگ ہیں"۔ یہ تقدیم و تاخیر محض اردو زبان کے محاورے اور ترجمانی میں زور پیدا کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

وجودِ باری: "ذہنی ارتقاء کی ایجاد"

(از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ حیدر آباد دکن)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب انسان کو کسی چیز کی حقیقت یا اس کے اسباب و محرکات کی کنہ معلوم نہ ہو تو وہ اس کے بارے میں قیاس آرائی شروع کر دیتا ہے۔ اور اپنی عقل سے اس قیاس کو معقولیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اس قیاس کو یقین باور کرنے پر اصرار بھی کرتا ہے اور جو شخص اس کے ایجاد کردہ قیاسی نظریہ کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو اسے نادانی یا کم عقلی سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی حال آج کل ان کے کورچشم نام نہاد فلاسفروں کا ہے جو ہستئ باری تعالیٰ کو بھی ارتقاءِ ذہنی کا نتیجہ بتلاتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس بارہ میں ان کا کوئی متفقہ خیال نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ مختلف قیاسات دوڑاتے ہیں۔ گو یہ قیاسات اصولاً تو متفق نظر آتے ہیں کہ وجود باری کا یہ مسئلہ ذہنی ارتقاء کا نتیجہ ہے مگر ارتقائی زاویۂ فکر یعنی اس ترقی کے اسباب و منازل کی تفصیلات بالکل مختلف بلکہ بعض اوقات متخالف نظر آتی ہیں۔ اس لیے اس کی جزئیات پر الگ الگ جرح تو محال ہے۔ البتہ اجمالاً اصولی طور پر اس نظریہ کی تنسیط کے لیے مندرجۂ ذیل دلائل کافی ہیں:۔

مسئلہ ارتقاء میں توسیع اس سے پہلے میں ان ارتقاء والوں کی ایک لغزش کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اول اول اس مسئلہ کو حیوانات کی مختلف انواع تک محدود رکھا گیا کہ یہ چیزیں اپنی ادنیٰ حالتوں سے ترقی پاکر موجودہ صورتیں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ ایک وسیع مسئلہ بن گیا۔ اور یہاں تک اس کو بڑھایا گیا کہ انسانی تاریخ و خیالات۔ توہمات و عقائد سب کے سب ارتقاء کے ماتحت سمجھے جانے لگے۔ اور اسی طرح وجود باری کے عقیدہ کی توجیہ بھی مسئلہ ارتقاء کے تحت ہونے لگی۔

ارتقاء کے تین نظریات چنانچہ بعض کا یہ نظریہ ہے کہ وجود باری انسان کے جذبۂ خوف کی ایجاد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب انسان میں شعور پیدا ہوا تو اس نے اپنے اردگرد ایک خوفناک ماحول پایا۔ ایک ایسا

پُرہول نیچر کہ مثلاً خونخوار درندے ۔خطرناک دبائیں اور قدرتی قحط ۔زلازل اور اسی طرح وہ فوق الفہم اور حیرت زا انتظامِ شمسی جس نے انسان کے اندر حیرت و خوف کے جذبات پیدا کر دیئے ۔ اور ظاہر ہے کہ انسان ہمیشہ حیرت و خوف کے جذبات میں گھر کر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا ۔ اس لیے اپنی ڈھارس و پناہ سکون و اطمینان کے لیے اس کے نفس نے یہ تجویز کی کہ ان خوفناک اور ڈراونی اشیاء کو مجاجت و خوشامد کے ذریعہ راضی کیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ اس نے ان کی پوجا شروع کر دی ۔

اور پھر جوں جوں اس کا شعور ترقی کرتا گیا اور ذہنی رفعت اس کو حاصل ہوتی گئی ۔ اسی نسبت سے وہ اپنے قدرتی جذبۂ خوف سے پناہ ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک ایسے خدا کا قائل ہو گیا جو تمام طاقتوں کا مالک ہے !

اسی طرح ماہرِ نفسیات پروفیسر فرائیڈ کا ذہنی اختراع یہ ہے کہ چونکہ انسانی فطرت کی بنیاد نفسانیت و شہوت پر ہے اور ہر شخص اس دنیا میں آزادانہ طور پر ان خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا اور جب دو افراد کی خواہش ٹکرا جائے تو لڑائی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس لیے وہ ان خواہشات کی تکمیل صرف ایک ہی صورت میں کر سکتے تھے کہ جب افراد حتی الوسع ایک دوسرے سے امن میں رہتے ہوں اور امن کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو دوسرے کے لیے قربان کر دے اور یہ قربانی بھی اس وقت تک محال ہے ۔ جب تک کہ اس کا معاوضہ ہو ۔ لیکن چونکہ دنیا میں انسانی قربانی کا کوئی حقیقی معاوضہ نہ مل سکتا تھا اس لیے اس نے ایک خیالی معاوضہ (خدا) تجویز کیا اور یہی خیالی معاوضہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا موجودہ صورت کو پہنچا ۔

اس سلسلہ میں تیسرا نظریہ ماہرینِ اقتصادیات کی ایجاد ہے جو موجودہ تمدن سے سخت متنفر ہیں اور اس کی بنیادوں کو ہلا دینا چاہتے ہیں ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وجودِ باری دراصل امراء و غرباء کی تمدنی کشمکش کا نتیجہ ہے ۔ کیونکہ ایک امیر اپنی امارت میں استقلال کے لیے یہی چاہتا ہے کہ غریب ہوشیار ہو کر اپنی حالت کو نہ بدلیں اور غرباء کو غافل رکھنے کے لیے ضروری ہوا کہ ان کے دل میں یہ خیال

بٹھا دیا جائے کہ :۔۔۔۔۔

غربت و امارت وغیرہ امور مقدور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نگراں خدا ہے جو خوب جانتا ہے کہ نظامِ عالم کو چلانے کے لیے دولت کی تقسیم کس طرح ہونی چاہیے۔ اُس نے امیر و غریب میں تقسیم کر رکھی ہے اور اسی تقسیم پر ہر انسان کو قانع رہنا چاہیے۔ پس عدمِ مساوات کو قائم رکھنے اور امیر و غریب کی تفریق کے استحکام کی خاطر غرباء کو غافل رکھنے کے لیے امراء نے وجودِ باری کا یہ عقیدہ تجویز کیا ہے اور ابتداءً یہ صرف خیالی تھا لیکن بعد میں رفتہ رفتہ عادتاً و حقیقتاً انسانوں میں رائج ہو گیا۔

قیاسی نظریئے | مندرجہ بالا تینوں نظریات پر یکجائی نظر ڈالنے کے بعد ناظرین نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ صرف قیاسی نظریئے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص رات کے ایک دو بجے گلی سے گزر رہا ہو تو اس کے بارہ میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی ڈاکٹر ہے۔ یا سی۔ آئی۔ ڈی پولیس کا آدمی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کوئی ایسا مریض ہو جو نیند کی حالت میں چلنا شروع کر دیتا ہے یا ممکن ہے وہ کوئی ایسا شخص ہو جو گھر میں مریض کی حالت ناگفتہ بہ دیکھ کر ڈاکٹر کی امداد طلب کرنے جا رہا ہو۔ غرض مختلف قیاسات قائم کر کے بعض عقلی ثبوت بھی پیش کیے جا سکتے ہیں اسی طرح ان ارتقاء والوں نے اپنے نظریات و قیاسات کے ثابت کرنے کے لیے ان لوگوں کے حالاتِ زندگی سے استدلال کیا ہے جن کا مذہب ایک مسخ شدہ حالت میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بگڑے ہوئے مذہب پر قیاس آرائی شروع کر دی جائے تو اس سے غلط نتائج اور فاحش نظریات ہی قائم کیے جا سکتے ہیں۔

اور یہی ان کی بنیادی لغزش ہے!

ہاں اگر وہ اپنے نظریات کو انبیاء کرام کی زندگیوں پر چسپاں کر کے دکھلاتے جو دراصل مذہب کے بانی ہیں تو ایک حد تک قابلِ قبول ہوتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اسی بنیادی غلطی کے باعث ان کے نظریات و قیاسات محض خیال آرائی ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اب میں اس اصولی غلطی سے آگاہ کرنے کے بعد مندرجہ بالا ہر سہ قیاسات پر الگ الگ اجمالاً تنقیدی نظر ڈالوں گا۔

وجودِ باری اور خوف جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہستیٔ باری کا وجود جذبۂ خوف وحیرت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے صحیح نہیں کہ اگر وجودِ باری کا عقیدہ خوف وحیرت کا نتیجہ ہوتا تو اس عقیدہ کے بانی انبیاء سب سے زیادہ بزدل ہوتے اور دنیا کی مادی قوتوں سے خوف کھاتے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ اس عقیدہ کی تبلیغ و تلقین اور اس کے قیام کے سلسلہ میں اپنی جان و آبرو کو خطرہ میں ڈالتے رہے ہیں اور دنیا کا کوئی خطرہ اور دنیا کا کوئی خوف ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکا۔ اور اسی طرح اگر یہ عقیدہ مختلف اوہام کی ایجاد ہے تو انبیاء کرام کو سب سے زیادہ توہمات میں گرفتار ہونا چاہیے اور سب سے زیادہ شکوک و شبہات کا شکار بننا چاہیے تھا۔

مگر اس کے برعکس اشد ترین مخالف اور مذہب کا انکار کرنے والے بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں، کہ ان کی زندگی حق الیقین کے اس بلند و بالا اور مستحکم چٹان پر قائم رہتی ہے جس سے دنیا بھر کی مخالفتیں سارے خوف اور اوہام ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر یہ عقیدہ خوف کا لازمہ تھا تو پھر عقل یہ کہتی ہے کہ جوں جوں ہم کسی نبی کے قریب زمانہ کی طرف قدم بڑھاتے جائیں۔ اسی نسبت سے اوہام بڑھتے ہوئے نظر آنے چاہییں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ نبی کے اپنے زمانہ اور نبی کے قریب زمانہ میں توہمات کا نام و نشان نہیں ملتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جوں جوں ایک نبی کے زمانے سے دور ہوتے جائیں گے اسی قدر توہمات اور شکوک و شبہات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ مثلاً آج مسلمانوں میں قبر پرستی۔ پیر پرستی تعویذ پرستی اور جنتر منتر پرستی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب میں شجر پرستی۔ حجر پرستی۔ آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی وغیرہ غلط اور خلاف مذہب عبادات رواج پذیر ہو گئی ہیں تو ایسے مسخ شدہ مذہب اور گم گشتہ راہ اہل مذاہب کے خیالات و عقائد فاسدہ اور اوہامِ باطلہ سے استدلال کرنا عقل مندی کا مذاق اڑانا ہے اور یہ نتیجہ نکالنا کہ اسی طرح خدا پرستی بھی جذبۂ خوف کی ایجاد کردہ ہے قرینِ انصاف نہیں۔

پس انبیاء جو وجود باری کا عقیدہ دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ اگر جذبۂ خوف سے متاثر ہو کر اس کی تلقین کرتے ہوتے تو خود بھی بزدل ہوتے اور مختلف اوہام و شکوک و شبہات، توہمات میں

سب سے زیادہ گرفتار ہوتے۔ اور ایسی باتوں کی نشر و اشاعت پر ہی زور دیتے۔ اور پھر ان کے قریب زمانہ میں بھی ایسی باتیں رواج پذیر رہتیں مگر واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں، نہ نبی کی زندگی ان چیزوں میں بسر ہوتی ہے اور نہ نبی کے فوراً بعد یہ چیزیں نظر آتی ہیں بلکہ جن کے دل مذہب سے برگشتہ ہوتے ہیں۔ وہ ان توہمات میں گرفتار نظر آتے ہیں اور ایسے لوگوں کے طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہوئے وجودِ باری کو بھی خوف کا نتیجہ قرار دینا انتہائی نادانی ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ اسی طرح یہ قیاس کہ جذباتی کشمکش میں توازن برقرار رکھنے کا علاج اور دوسروں کی خاطر قربانی کرنے کا خیال معاوضہ خدا کی صورت میں تجویز کیا گیا۔ بایں وجہ باطل ہے کہ اگر یہ خیال درست ہوتا تو سب سے زیادہ انقباضِ طبیعت اور جذباتی کشمکش انہی لوگوں میں نظر آتی جو وجودِ باری کے ناشر تھے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انبیاء میں ان کی عمر کے کسی حصہ میں بھی ایسا انقباض یا ایسی کشمکش پائی جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے برعکس نبی اپنے بچپن و جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں سکینت کی ایک حسین تصویر ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی نبی کی زندگی پر نظر ڈالو۔ سکینت ہی سکینت پاؤ گے۔ ان کو اپنی خواہشات سے کبھی جنگ نہیں کرنی پڑی۔ اور اگر بالفرض ایک نبی اپنے بڑھاپے میں وجودِ باری کے عقیدہ میں راسخ ہو کر انقباضِ طبیعت اور جذباتی کشمکش فرو کر چکا تھا۔ تو کم از کم جوانی میں یہ باتیں اس میں موجود ہوتیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح وجودِ باری انقباض و کشمکش جذبات کی ایجاد ہوتا تو ان انبیاء کی تعلیم میں کبھی کوئی ربط و نظام نہ پایا جاتا۔ اور ان کی ساری باتیں مجنونانہ ہوتیں لیکن معاملہ برعکس ہے۔ ان کی تعلیم اور ان کے احکام انتہائی دانائی سے پر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیا تمدنی و علمی اور سیاسی و معاشی امور میں اپنی ساری دانائی انبیاء سے ہی لیتی ہے۔

عدم مساوات کا نظریہ اسی طرح ماہرینِ اقتصادیات کا یہ کہنا کہ وجودِ باری کا تصور عدم مساوات کو جاری و قائم رکھنے کے لیے معرض وجود میں آیا، مذہب پر صریح الزام ہے۔ کاش اگر وہ انبیاء کے حالات زندگی اور مخلوق کے ساتھ ان کے سلوک کو ایک ادنیٰ نظر سے بھی دیکھتے تو کبھی ایسا قیاس نہ کرتے

اور اگر بالفرض ان کا یہ قیاس صحیح ہوتا تو پھر انبیاء کو سب سے زیادہ عدم مساوات کا حامی ہونا چاہیے تھا، کیونکہ وہ اس عقیدہ کے بانی تھے۔ مگر اس کے برعکس وہ عدم مساوات کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کرکے ایک ایسا معاشرہ قائم کر جاتے ہیں جس میں دنیوی ثروت و امارت کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ایسی تعلیم اور ایسے احکام پیش کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں امارت و ثروت کو استقلال و دوام حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں میں انبیاء کی اقتصادی تعلیم سے درگزر کرتے ہوئے اس نظریہ کے قائلین کی توجہ اسلام کے اقتصادی نظام اور معاشی اصول کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے

کیا اسلام نے اپنی عبادات اور تہذیب و تمدن مساوات کی بنیاد پر قائم نہیں کی؟

کیا اس نے معیارِ تکریم اور وجہ تفوق امارت و ثروت اور دنیوی جاہ و حشمت کے بجائے تقویٰ و خدا ترسی کو قرار نہیں دیا؟

اسلام میں سود کا امتناع، ایتاء زکوٰۃ کا حکم جو دراصل سرمایہ پر مستقل بھاری ٹیکس ہے۔ اور اسی طرح قانونِ وراثت جو دولت کو صرف ایک شخص کی تجوری میں بند نہیں رکھتا۔ اور اسی طرح نظامِ صدقہ و خیرات سے متعلق احکام کیا عدمِ مساوات اور امیر و غریب کی تفریق کو مٹانے کے لیے کامیاب علاج اور یقینی تریاق نہیں۔

علاوہ بریں اگر امراء ہی وجود باری کے موجد ہوتے تو کیا وجہ ہے کہ جب بھی خدا کی توحید کو قائم کرنے کے لیے کوئی نبی کھڑا ہوتا ہے تو امراء ہی سب سے زیادہ اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں اور غرباء اس کی تائید میں پیش پیش رہتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جب بھی کوئی خدا منوانے والی تحریک دنیا میں اٹھتی تو تمام امراء کی تائید اس کو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ امراء تو پیچھے رہ جاتے ہیں اور غرباء اس تحریک کی اشاعت میں تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ عام طور پر خدا منوانے کے لیے ایک غریب ہی مبعوث ہوتا ہے۔ جس کے پاس کوئی دولت و ثروت عموماً نہیں ہوتی۔

پس ماہرینِ اقتصادیات کا یہ کہنا کہ عدمِ مساوات اور امیر و غریب کی تفریق اور اقتصادی برتری کے قیام کی غرض سے امراء کی طرف سے وجود باری کا عقیدہ معرضِ وجود میں آیا صریحاً غلط ہے۔

یہ عقیدہ الہامی ہے اب آئیے! میں آپ کو بتاؤں کہ یہ عقیدہ دنیا میں کیسے قائم ہوا۔ اور کن کے ذریعہ پھیلا؟ ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ ان لوگوں کے ہر سہ قیاسات کتنے بودے اور کمزور ہیں جو تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی یہ لاحاصل کوشش اور بے جا اصرار ہے کہ وہ اس عقیدہ کو ذہنی ارتقاء کی ایجاد ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ اگر وہ قدیم سے قدیم اقوام کے عقائد اور بعد میں آنے والی قوموں کے عقائد کا موازنہ کریں تو ان کو معلوم ہو کہ ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ بلکہ ایسی مماثلت نظر آتی ہے جو ایک انسان کو ورطۂ حیرت و استعجاب میں ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اور اس مماثل عقیدہ کو ہر دور میں بعض مخصوص و معیّن ہستیوں نے قائم کیا ہے اور انہی پاک ہستیوں کی شہادت و تاثیر سے اس زمانہ کے لوگوں نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ اور پھر حیرت یہ کہ ان معین و مخصوص ہستیوں کا زمان و مکان بالکل مختلف۔ ان کی ایک دوسرے سے ملاقات کوئی ثابت نہیں کر سکتا۔ الا ماشاء اللہ۔ انہوں نے ایک ایسی متماثل اور متوازن تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی جس نے بعد میں چل کر ایک عظیم انقلاب کی صورت اختیار کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیا کسی ذہنی اختراع سے پیدا شدہ عقیدہ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ عظیم انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ جو اس تعلیم نے برپا کر کے دکھلا دیا۔

بے شک انبیاء کی تعلیم ایک نئی چیز نظر آتی ہے۔ مگر ان معنوں میں نہیں جس کو ہم ذہنی اختراع سے تعبیر کر سکیں۔ دنیا میں کئی فلاسفر ایسے گزرے ہیں۔ اور اب بھی موجود ہیں جو اپنے ذہن سے کئی نئے خیال پیدا کرتے ہیں اور پھر بعد میں اکثر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں مگر کبھی ایسے فلاسفروں کی مخالفت نہیں کی جاتی جو بے سروپا نظریات قائم کرتے ہیں اور اگر مخالفت کی بھی جاتی ہے تو نہایت معمولی لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ انبیاء جو عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کی کتنی شدید مخالفت کی جاتی ہے۔ چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا سبھی اس کی مخالفت پر تل جاتے ہیں۔ اور انہی مخالف حالات میں کامیاب زندگی گزارتے ہوئے اپنا مشن قائم کر جاتے ہیں۔ ہر نبی کا خطرناک مقابلہ کیا جاتا رہا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ارتقائی اشیاء و خیالات کی بھی کہیں اس درجہ مخالفت کی جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! مخالفت تو کجا ان کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ چیزیں کب اور کس طرح اور کس کے ذریعہ معرضِ وجود میں آئیں۔

پس یہ شدید مخالفت خود ثبوت ہے اس امر کا کہ اس عقیدہ کے ساتھ ارتقاء کا کوئی تعلق نہیں۔ ذہنی ارتقاء نے اس مسئلہ کو ایجاد نہیں کیا۔ بلکہ بذریعہ الہام انسانی ذہن میں اس کو بٹھایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وجودِ باری کا عقیدہ قدیم سے قدیم اور نئی سے نئی قوم میں پایا جاتا ہے اور پھر من حیث المجموع اس کی ذات و صفات کے بارہ میں یکساں خیال موجود ہے۔ پس یہ ہم آہنگی اور اس عقیدہ کے قیام میں انبیاء کی شدید مخالفت اور ان سے یکساں سلوک اور ان دانا و فہیم اور پاک ہستیوں کی ثقہ شہادت اور اسی قسم کے کئی شواہد و نظائر از قبیل نشانات و پیش گوئیاں مسئلہ وجودِ باری کے ارتقائی نہ ہونے اور الہامی ہونے پر کافی دلیل ہیں۔

سیاحتِ جرمنی کے مشاہدات

(از محمد المبارک۔ پرنسپل شریعت کالج، شام)

دو ماہ قبل مجھے مختلف اسلامی ممالک کے ایک نمائندہ وفد میں فیڈرل جرمنی جانے کا موقع ملا اس دورے میں ہم نے میونخ، ہینوور، منسٹر، بون، ہمبرگ اور مغربی برلن وغیرہ شہروں کی سیاحت کی۔ جرمنی کی سیاحت کرنے والا جب وہاں کے فکری ڈھانچہ اور سیاسی و اقتصادی نظام اور جدید تقاضوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنا کر سیاحت کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں ایک ایسا سماجی تجربہ کیا جا رہا ہے جو حیرت انگیز بھی ہے اور مفید بھی۔ جرمنی ایک ایسے کٹھن تجربے سے گزرا ہے جس کے نتائج سے وہ آج تک پیچھا نہیں چھڑا سکا ہے۔ جرمنی قوت و شوکت اور خود کفالت کی بلندی سے کمزوری اور بٹوارے کی پستی میں آگرا۔ اسے ان قوموں کا تابع فرمان بننا پڑا جن کو جرمنی بلحاظ عبقریت وحیثیت اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ جنگ سے پہلے نازی عہد میں جرمنی کی مادی اور ذہنی قوتوں کو اس عقیدے کی بنیاد پر پروان چڑھایا گیا تھا کہ جرمن نسل نہ صرف ایک متمدن نسل ہے اور غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے بلکہ وہ اس بات کی بھی حقدار ہے کہ دوسری قوموں پر جو بہر حال اس سے کم تر ہیں، اُسے بالادستی حاصل رہے۔ جرمنی کی فوجی طاقت، صنعتی نظام اور تنظیمی قوت حیرت انگیز حد تک اوج کمال پر پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نسلی برتری کا احساس اور طاقت و بالادستی کا گھمنڈ بھی آخری حد کو چھونے لگا تھا۔ یا تو یہ حالت تھی اور یا جنگ کے خاتمے کے بعد وہی جرمنی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اور اس پر چار ملکوں کی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے تمام بڑے بڑے شہروں کی گنجان آبادیاں، صنعت و حرفت اور چہل پہل یکایک کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں تباہی کی اوسط نوے فی صد تک پہنچی ہے۔ مکانات جو منہدم ہوئے

ان کی تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ معاشی بدحالی عام ہو گئی۔ جانی نقصان ستر لاکھ سے متجاوز تھا۔ قیدیوں کی تعداد ساڑھے تیس لاکھ تک اور تارکینِ وطن کی تعداد ایک کروڑ پچاس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ مزید برآں سرزمینِ جرمنی کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ یعنی مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، جرمنی کا وہ حصہ جو پولینڈ کے ساتھ ملحق کیا گیا اور وہ حصہ جو سوویٹ روس کے ساتھ ملایا گیا۔ پھر برلن شہر کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ جرمنی کی یہ تقسیم آج تک قائم ہے۔ جنگ کے دوران اور بالخصوص شکست کے بعد جرمنی کو اپنی ہمسایہ اقوام اور فاتح افواج کے ہاتھوں قتلِ عام، آبروریزی، وحشیانہ مظالم اور تاخت و تاراج کے جن ہولناک المیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور تاریخِ انسانی کے تاریک ادوار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ان مصائب و آلام اور تلخ تجربوں نے جرمنوں کو اپنی فکری بنیادوں اور سیاسی و اقتصادی نظریات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اور ان نظریات کو موردِ تنقید بلکہ موردِ ملامت ٹھیرایا جو قومی انانیت و تکبر اور نسلی عصبیت پر مبنی تھے کیونکہ یہی تو وہ نظریات تھے جنہوں نے دوسری قوموں کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ان کے خلاف بھڑکا دیا تھا اور ان کے دماغ میں غرور کی ہوا اس قدر بھر دی تھی کہ دوسری قوموں کے ساتھ برادرانہ تعاون اور اشتراکِ عمل کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ ان قوم پرستانہ نظریات نے جرمنی کے اندر ایک شدید نوعیت کے آمرانہ اور مستبدانہ نظامِ حکومت کو جنم دیا تھا۔ ایسے نظام میں قوم کا سربراہ ہی اصل مرکز ہوتا ہے کیونکہ وہ معاشرے کی روح کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسے نظام میں افراد کا نہیں بلکہ اس معاشرے کا اصل اعتبار ہوتا ہے جس کا مظہر سربراہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے افراد کو فنا کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی دریغ نہیں کیا جاتا جو معاشرے سے ہم آہنگ نہ ہو رہے ہوں۔ اس وجہ سے جرمنوں نے کمیونزم کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ ایک تو اس لیے کہ یہ ان کے فاتحین کا مذہب تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ ان کے نزدیک کمیونزم ہی جرمنی کے اتحاد و اتفاق کی راہ کا روڑا تھا۔

کمیونزم اور تنگ نظرانہ قوم پرستی کا ردِ عمل ایک طرف روحانی اقدار کے احیاء اور دوسری

طرف غیر قوموں کے ساتھ تعاون کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں میں ازسرِنو زندگی پیدا ہوگئی اور وہ اپنے سابقہ بُعد اور اختلاف کے علی الرغم ایک دوسرے کے قریب تر آگئے ہم نے ایسے بہت سے کلیسا دیکھے جو نئے تعمیر شدہ تھے اور جن کی تعمیر میں نئی نقطۂ نظر سے نئی اصلاحات جھلک رہی تھیں۔ بلکہ بعض کلیساؤں کی تعمیر میں تو کھلم کھلا ان قدیم روایات اور قدامت پرستانہ طرزِ تعمیر سے انحراف کیا گیا ہے جو کیتھولک کلیساؤں کے ہاں جاری وساری رہا ہے۔ یہ مذہبی روح صرف کلیساؤں ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یونیورسٹیوں، فوجوں اور سماجی بہبود کے بیشتر اداروں میں بھی کارفرما ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ہر جرمن ان مصائب و آلام کی تلخی کا شدید احساس رکھتا ہے جنہوں نے اس کے وطن کو ویران کر دیا، اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اسے فاتحین کے قدموں کی جولانگاہ بنا ڈالا اور ان کے نفوذ و اقتدار کے پنجہ میں دے دیا۔

چنانچہ ہر جرمن اپنے ملک کو ان مصیبتوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے پیہم سرگرمِ عمل ہے جرمن قوم نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں اپنے شہروں کو جن کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی از سرِ نو تعمیر کر لیا ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم الشان کارخانے بھی نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم کر لیے ہیں بلکہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے بنالئے ہیں۔ اور یہ تو خیر معمولی بات ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا کامیاب اقتصادی نظام استوار کر لیا ہے جو بیک وقت آزاد اور زیرِ نگرانی (CONTROLED) معیشت کی کامیابی کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی میں یہ نظام بارآور ہو چکا ہے اور آج جرمنی کی مصنوعات اپنی عمدگی و نفاست اور مضبوطی کی قدیم روایات کے ساتھ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔

جرمنی کا یہ معاشی نظام چار اصولوں پر قائم ہے۔

(۱) آزاد انفرادی سرگرمیوں کے لیے پوری گنجائش رکھی گئی ہے۔ افراد کو ابھرنے اور اپنی محنت سے نفع اندوز ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ نفع اور باہمی مقابلے کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

(۲) ایک طرف انفرادی آزادیٔ عمل کو برقرار رکھا جاتا ہے اور دوسری طرف ذخیرہ اندوزی کی اجازت نہیں دی جاتی جو سرمایہ دار ممالک میں عام طور پر رائج ہے۔

(۳) عمومی آسائش اور سہولیات تمام قوم کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہر شخص بیماریوں کے لیے علاج اور بچوں کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وہ ساری ضروریات بڑی آسانی سے پوری کر سکتا ہے جو ایک متمدن معاشرے میں معلوم و معروف ہوتی ہیں۔

(۴) اس نظام کے تحت ملک میں متزاید محصول (PROGRSSIVE TAXATION) کا اصول رائج ہے جس کی وجہ سے روزگار عام ہے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو گیا ہے۔ ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور مفادات کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اسی اصول کی برکت سے جرمن قوم کی شرح ٹیکس دنیا کی دوسری تمام قوموں کی شرح سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک جرمن اوسطاً چودہ سو مارک سالانہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ گویا متزاید محصول کا تناسب ۶۵.۵ ٪ تک پہنچ جاتا ہے۔

جہاں تک بیرون ملک اس نظام کی کامیابی کا تعلق ہے تو اس کے ثبوت میں جرمن کرنسی کی قوتِ مبادلہ اور اس کی ساکھ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کی بدولت ہی جرمنی اپنی مصنوعات برآمد کرنے پر نہ صرف یہ کہ قادر ہو سکا ہے بلکہ آج جرمنی دنیا کے برآمد کنندہ ممالک کی صفِ اول میں کھڑا ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے دوش بدوش اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ممالک کی امداد کرنے والے بین الاقوامی اداروں کو قرضے جاری کرتا ہے اور سرمایہ کی فراہمی میں حصہ لیتا ہے۔ اندرونِ ملک بھی یہ نظام نہایت کامیابی سے چل رہا ہے چنانچہ آپ کو سارے ملک میں ایک شخص بھی فقیر و محتاج نہیں ملے گا۔ بلکہ اس کے برعکس قوم کے تمام طبقات کا معیارِ زندگی اس حد تک بلند ہو چکا ہے کہ دوسرے ملکوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر فرد کام کاج اور مقدور بھر ترقی کرنے کی پوری آزادی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ حکومت خود نہ کوئی کاروبار کرتی ہے اور نہ کاروباری اداروں کو اپنی ملکیت میں لیتی ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ایک طرف ناجائز نفع اندوزی اور ذخیرہ اندوزی کو روکتی ہے اور دوسری طرف ملک کے اندر روزگار اور مفادِ عامہ کے اداروں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیتی ہے۔

چنانچہ پیشہ طبابت عملاً قومی تحویل کے حکم میں ہے یعنی مزدوروں اور طالب علموں وغیرہ کی انجمنوں کی طرح وہاں ایسی منظم انجمنیں قائم ہیں جن میں قوم کا ہر فرد داخل ہو سکتا ہے۔ ان انجمنوں کو معمولی سی معینہ رقم کے عوض علاج کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اس طرح طبی امداد و علاج بھی سستا ہو گیا ہے اور حکومت کو کوئی ضرورت اس بات کی نہیں رہی ہے کہ وہ نیشنلائزیشن کے اصول کو باقاعدہ طور پر اپنائے بلکہ اس کے برعکس حکومت نے مشہور موٹر ساز کارخانہ (فاکس ویگن) کی طرح کے بڑے بڑے کارخانوں کو جو پہلے قومی ملکیت میں تھے آزاد کر دیا ہے اور انہیں مشترکہ سرمائے کے کاروباری اداروں (JOINT STOCK COMPANY) کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

درحقیقت جرمنی کا اقتصادی نظام اس قابل ہے کہ وہ تمام ترقی پذیر ممالک جو آج اپنا اقتصادی ڈھانچہ تیار کرنے میں مشغول ہیں اس نظام کا گہری نظر سے جائزہ لیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسا کامیاب نظام ہے جس نے مختلف اقتصادی نظاموں کے محاسن کو جمع کر لیا ہے اور ان کے معائب سے دامن بچایا ہے۔ یہ نظام افلاس اور بے روزگاری کا قلع قمع کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ اس نظام کے ذریعہ سے قومی اور انفرادی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور انفرادی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے آرام و آسائش اور خوشحالی عام کی جا سکتی ہے۔ اس طرح شہریوں کو ریاست کے بوجھ، تشدد اور اپنی آزادی پر ایک ایسی قدغن کے احساس سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے جو انہیں ملکی پیداوار کی خاطر مشین کا ایک بے جان پرزہ یا ایک تابع مہمل جانور بنا ڈالے۔

آخر میں برسبیل تذکرہ اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیے دیتا ہوں جو اگرچہ دوسرے لوگوں کے نزدیک تو جانی پہچانی ہے مگر ہم اسے یاد رکھنے کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ یورپ میں بالعموم اور جرمنی میں بالخصوص دیکھا جاتا ہے کہ ہر شخص دوسرے شخص کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ کوئی شخص کسی کے حق پر دست درازی نہیں کرتا اور اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کے لیے پولیس یا قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بات صرف افراد کے باہمی حقوق ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ عام نظم و نسق اور پبلک مقامات مثلاً باغات اور تفریح گاہیں بھی ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رہتی ہیں۔ چنانچہ دن اور رات میں کسی بھی وقت

کسی باغ میں اگر آپ چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی شخص نہ کسی پھول کو توڑتا ہے اور نہ کسی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہاں انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے پرندے پنجروں میں بند ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہاں چپے چپے پر چوکیدار موجود ہوں بلکہ لوگوں کے ضمیروں میں از خود وہ حس موجود ہوتی ہے جو انہیں اس اجتماعی سرقے سے روکتی ہے۔ اسی طرح جب ٹریفک گزر رہا ہو تو آپ کسی کو سڑک پار کرتے ہوئے نہیں دیکھیں گے اور نہ کسی ایسی شارع عام کے درمیان کسی کو چلتا ہوا پائیں گے جو صرف موٹروں کے لیے مخصوص ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ازدحام کے مقامات پر کوئی شخص کہنی مار کر آگے بڑھ جانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ترتیب اور نظم کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی دکاندار سستی چیز آپ کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت نہیں کرے گا۔ نہ قیمت کے بارے میں دھوکا دینے یا جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ باتیں خواہ وہ تعلم و نسق سے متعلق ہوں یا لوگوں کے حقوق کی حفاظت سے، اور خواہ اجتماعی حقوق سے تعلق رکھتی ہوں یا کاروباری اخلاق سے متمدن زندگی اور وحشیانہ زندگی کی کسوٹی ہوتی ہیں۔ اخلاق کے وجود اور عدم کا پتہ انہیں باتوں سے لگتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم جن کی سرزمین میں آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور مذہبی تعلیمات کا غلغلہ بلند ہوا اور جن کے اسلاف کا طرۂ امتیاز مکارمِ اخلاق تھا اپنے آپ کو ذرا ان کسوٹیوں پر بھی پرکھ کر دیکھیں۔

جرمنی کے بیس روزہ مختصر سے دورے میں جو کچھ دیکھا اس میں سے کچھ بطور مشتے از خروارے اس امید پر اپنی قوم کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر دیا ہے کہ شاید وہ اس میں اپنے لیے عبرت اور نصیحت کا کوئی سامان پا جائیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ترقی کی راہ کے تجربات میں ہمیں ایک گونہ مدد مل جائے کیونکہ مختلف قوموں کے تجربات خواہ وہ کسی بھی مذہب سے وابستہ ہوں، ہماری قوتِ فکر و عمل کے افق کو وسعت بخشتے ہیں۔ ہمیں اپنی اقتصادی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے دنیا کے رائج الوقت نظاموں میں سے کسی خاص نظام پر اپنی نگاہیں نہیں مرکوز کر لینی چاہییں اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس ایک وہی نظام ایسا ہے جس میں قوم کے لیے خوش حالی کا مژدہ ہے انفرادی اور قوم کے

. . . . . ہر طبقے کے لیے انصاف کی ضمانت ہے چاہے اس میں آزادیوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹ دیا جائے اور دین اور روحانی اقدار کا کلی استیصال ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

پھر یہ بات بھی تو ہے کہ یہ مختلف تجربات مختلف مفید تدابیر کی جانب ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ حدیث نبوی ——— الحکمة ضالة المؤمن" کی رُو سے دانائی کی بات مومن کی متاعِ گم شدہ ہے۔

(ماخوذ از حضارۃ الاسلام) ترجمہ: عمر فاروق مودودی

رمضان المبارک ——— کی ——— خوشی میں

تفہیم القرآن کی قیمتوں میں خصوصی رعایت

ہم رمضان المبارک کی خوشی میں نہایت مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن کے سلسلے میں درج ذیل خصوصی رعایت دی جائیگی

جلد اوّل۔ سورہ فاتحہ تا سورہ الانعام	۲۱ — ۲۵
جلد دوم۔ سورہ الاعراف تا بنی اسرائیل	۲۲ — ۷۵
جلد سوم۔ سورہ الکہف تا سورہ الروم	۲۷ — ۵۰
محصول ڈاک	۴ — ۵۵
	۷۶ — ۰۵
خصوصی رعایت	۶ — ۰۵
	۷۰ — ۰۰

اس کے ساتھ ہی ایک سال کے لیے ماہنامہ "تعمیر انسانیت" مفت جاری کر دیا جائے گا جس کا سالانہ چندہ ۵ روپیہ ہے۔

مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ لاہور

رسائل و مسائل

تجارتی حصص اور کرائے پر دی جانے والی اشیاء کی زکوٰۃ

سوال (۱) تجارتی حصص کی زکوٰۃ کے بارے میں جولائی ۶۲ء اور نومبر ۵۰ء جلد ۳۵ عدد ۲ کے ترجمان القرآن میں آپ کی تحریریں سامنے ہیں۔

اصول کا تقاضا یہ ہے کہ شرکت پر دیئے ہوئے سرمائے کی زکوٰۃ صرف ایک بار وصول کی جائے۔ اس اصول کے مطابق اگر آپ کی نومبر ۵۰ء کی تحریر کے مطابق کمپنی سے زکوٰۃ یکجا وصول کر لی جائے تو پھر افراد سے ان کے مملوکہ تجارتی حصص پر نہیں وصول کرنا چاہیے۔ یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ "جو حصہ دار بقدر نصاب سے کم حصے رکھتے ہوں یا جو ایک سال سے کم اپنے حصے کے مالک رہے ہوں ... ان کو مستثنیٰ کر کے کمپنی سے حصص پر زکوٰۃ لی جائے۔" اکثر اوقات اس کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ جو حصہ دار ایک مخصوص کمپنی میں نصاب سے کم قیمت کے حصے کا مالک ہے وہ خود صاحبِ نصاب ہے کہ نہیں۔

مسئلے کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے۔ افراد سے ان کے مملوکہ حصص پر زکوٰۃ لینے اور کمپنی کے جملہ حصص پر زکوٰۃ لینے کے معاشی اثرات، بالکل مختلف ہونگے کمپنی کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ سالانہ زکوٰۃ کی رقم کو اپنی لاگت کا ایک مستقل جز سمجھ کر اسی حساب سے اپنے مال کی قیمت بڑھانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ پوری زکوٰۃ نفع ہی سے ادا کرنا ہمیشہ ممکن ہو یا ہمیشہ زکوٰۃ دینے کے بعد بھی حصہ داروں کو دینے کے لیے کچھ نفع بچ رہے۔ افراد سے زکوٰۃ لی جائے تو قیمتوں پر یہ اثر نہیں

مرتب ہوگا۔

اسی ترجمان کے صفحہ ۲۲ پر کرایہ پر دی جانے والی اشیاء کے قابل زکوٰۃ ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس اصول کا اطلاق کرایہ پر چلائی جانے والی ٹیکسی، ٹرک اور بسوں کی مالیت پر بھی ہونا چاہیے۔ اسی طرح جو شخص متعدد مکانات اور دکانوں کا مالک ہو اور ان کو کرایہ پر اٹھاتا ہو اس سے بھی مکانات کی جملہ مالیت کا ڈھائی فی صد ٹیکس وصول کرنا چاہیے۔ مجھے ان دونوں شکلوں میں زکوٰۃ کے وجوب پر دو وجہوں سے شبہ ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ سلف سے آج تک کرایہ پر دیئے جانے والے مکانات کی جملہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہونے کی رائے یا اس پر عمل سننے میں نہیں آیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب الاموال صفحہ ۲۷۶ کی لیث بن سعد کی جو روایت آپ نے دلیل کے طور پر پیش کی ہے، اس سے یہاں استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کرایہ کے اونٹوں کا کرایہ پر چلانا وجوبِ زکوٰۃ کا سبب نہیں ہے، بلکہ وجوب زکوٰۃ کی بنا ان کا اونٹ ہونا ہے۔ امید ہے کہ اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈال کر یہ شک دُور کریں گے۔

جواب: زکوٰۃ کے متعلق نومبر ۶۰ء کے ترجمان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حکومت کے سوالنامے کا جواب تھا۔ اُس میں جواب اس مفروضہ پر دیا گیا تھا کہ سرکاری طور پر کمپنیوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ جولائی ۶۲ء کے ترجمان میں ایک سوال کا جواب اس مفروضے پر دیا گیا ہے کہ کمپنی زکوٰۃ نہیں نکالے گی بلکہ ایک حصہ دار اپنی زکوٰۃ خود نکالے گا۔ اس فرق کو نگاہ میں رکھ کر آپ دونوں جوابات کو پڑھیں۔ کمپنی جب زکوٰۃ نکال دیگی تو ایک ایک حصہ دار کی الگ الگ زکوٰۃ نکلنے کا پھر کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ کمپنی کے لیے یہ مشکل ہے کہ ایک ایک حصہ دار کے متعلق یہ تحقیق کرے کہ وہ بجائے خود صاحبِ نصاب ہے یا نہیں۔ یہ تو ایسے حصہ داروں کا اپنا کام ہے کہ وہ کمپنی کو اپنے صاحبِ نصاب نہ ہونے کی اطلاع دیں تاکہ ان کے ذمہ کی زکوٰۃ محسوب نہ ہو۔

تحصیلِ زکوٰۃ اگر سرکاری انتظام میں ہو تو محصّلِ زکوٰۃ سے یہ بات نہیں چھپ سکتی کہ کمپنی نے اپنی نکالی ہوئی زکوٰۃ کو اپنے کاروباری مصارف میں شمار کر کے قیمتیں بڑھائی ہیں۔ اس چیز کی روک تھام سرکاری طور پر ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر سرکاری انتظام نہ ہو تو اس صورت میں صرف وہی کمپنی بطور خود اپنی زکوٰۃ نکالے گی جس کے چلانے والوں میں کوئی دینی حس موجود ہو گی۔ ایسے لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ہاتھ سے زکوٰۃ نکال کر دوسرے ہاتھ سے اس کو وصول کرنے کی تدبیریں اختیار کریں گے۔ اور بالفرض اگر وہ ایسا کریں تو دوسرے سال ان پر زکوٰۃ زیادہ لگ جائے گی۔ پھر قیمتیں بڑھائیں گے تو زکوٰۃ کے حساب میں مزید اضافہ ہو گا یہاں تک کہ آخر کار قیمتیں بڑھانا ممکن نہ رہے گا۔

کرایہ پر دی جانے والی اشیاء کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ مختصر تھا اس لیے بات واضح نہ ہو سکی۔ میرا مدعا یہ ہے کہ جو لوگ فرنیچر یا موٹریں یا ایسی ہی دوسری چیزیں کرائے پر چلانے کا کاروبار کرتے ہیں ان کے کاروبار کی مالیت اُس منافع کے لحاظ سے مشخص کرنی چاہیے جو اس کاروبار میں ان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فرنیچر یا ان موٹروں کی قیمت پر زکوٰۃ محسوب کی جائے جسے وہ کرائے پر چلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ تو وہ آلات ہیں جن سے وہ کام کرتے ہیں اور آلات کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں لگتی۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کاروبار جو منافع دے رہا ہو اُس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جائے گی کہ اس قدر منافع دینے والے کاروبار کی مالیت کیا قرار پانی چاہیے۔ رہے کرایہ کے مکانات تو ان کے بارے میں مجھے بھی اس بنا پر تامل ہے کہ سلف سے ان پر زکوٰۃ لگائے جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔

"الابل العوامل" (کام کرنے والے اونٹوں) پر زکوٰۃ نہ لگنے کی وجہ وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ ایک آدمی جن آلات یا حیوانات کے ذریعہ سے کام کرتا ہو ان پر زکوٰۃ نہیں لگتی۔ مثلاً ہل چلانے والے بیل، یا باربرداری کے جانور۔ ان پر زکوٰۃِ مواشی عائد نہ ہو گی۔ اسی طرح ڈیری فارم کے جانوروں پر زکوٰۃِ مواشی عائد نہ ہو گی۔ ان کی زکوٰۃ تو اُس پیداوار پر زکوٰۃ لگنے کی

صورت میں وصول ہو جاتی ہے جو اُن کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہو۔ کرایہ پر چلائے جانے والے اونٹوں پر بھی عوامل کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان پر بھی زکوٰۃ مواشی عائد نہ ہونی چاہیے اور نہ ان کی مالیت پر زکوٰۃ لگنی چاہیے۔ بلکہ اس کرایہ کے کاروبار کی جو GOODWILL مشخص ہو اس پر زکوٰۃ لگنی چاہیے۔

سوال (۲) تجارتی حصص کی زکوٰۃ سے متعلق آپ کی وضاحت کے بعد بھی ایک مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ تحصیلِ زکوٰۃ کے اعتبار سے ان دو شکلوں کو برابر کی متبادل شکلوں کی حیثیت نہیں دی جاسکتی کہ حصہ داروں سے حصص کے بازاری نرخ کے مطابق زکوٰۃ وصول کرلی جائے یا کمپنی سے تجارت کی زکوٰۃ کے اصول پر زکوٰۃ وصول کی جائے۔ دونوں شکلوں میں وصول کی جانے والی زکوٰۃ میں مقدار کے اعتبار سے زبردست فرق ہونا لازم ہے۔

حسابِ زکوٰۃ میں اس تفاوت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ یہ بات متعین کر دی جائے کہ زکوٰۃ دونوں طریقوں میں سے کس طریقہ سے وصول کی جائے گی۔

کرایہ پر چلائی جانے والی اشیاء کی زکاۃ کا مسئلہ بھی واضح نہیں ہوا۔ آپ نے جو شکل تجویز فرمائی ہے یعنی کاروبار کی GOODWILL اور منافع کی بنیاد پر اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ لگایا جائے اس پر متعدد اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس طرح قابلِ زکوٰۃ مال کا حساب کم سے کم ان اشیاء کی مجموعی قیمت کے برابر اور بعض اوقات اس سے زیادہ آئے گا، کیونکہ اگر کاروباری ادارہ پرانا اور اچھا ہے تو GOODWILL کی مالیت خاصی ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اس شکل کو اختیار کرنے کی شرعی دلیل کیا ہے؟ سلف سے اس طرح کی کوئی شکل منقول نہیں جب کہ کشتیوں، سواری کے جانوروں، مکانات، دکانوں وغیرہ کو کرایہ پر چلانے کا رواج قدیم ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شریعت نے بعض واضح

مصالح کے پیش نظر مال ظاہر اور مال باطن کے درمیان فرق کیا ہے اور مال باطن کی مقدار کا اعلان صاحب مال کے اوپر چھوڑ دیا ہے۔ اگر محصل زکوٰۃ اور اس شخص کے درمیان اختلاف ہوتا ہے جو کرایہ پر چلانے کا کاروبار کرتا ہے تو فیصلہ کیسے ہوگا؟

امید ہے کہ مسئلہ کے ان پہلوؤں پر غور فرما کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے۔

جواب: کمپنیوں کی زکوٰۃ کے معاملہ میں دو ہی شکلیں ممکن ہیں۔ یا تو اسلامی حکومت موجود ہوگی اور تحصیل کا باقاعدہ انتظام کرے گی، یا کوئی اجتماعی انتظام نہ ہوگا اور احساس فرض رکھنے والے افراد کو خود اپنی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ پہلی صورت میں کمپنی کے سارے حسابات دیکھ کر فیصلہ کیا جائیگا اور جن اثاثوں پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی ان کو حساب سے ساقط کر دیا جائے گا لیکن دوسری صورت میں منفرد حصہ داروں کے لیے اس طرح کے حسابات معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ تو لامحالہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کی ہی زکوٰۃ نکالیں گے۔

کرایہ پر چلانے کے کاروبار کی زکوٰۃ کا معاملہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ اس میں متعدد اصولی مشکلات کو میں خود بھی محسوس کرتا ہوں اور اس باب میں احادیث و آثار سے بھی کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ اس میں بڑی مشکل یہ ہے کہ جس سامان کو کرایہ پر چلایا جاتا ہے وہ مال تجارت کی تعریف میں نہیں آتا۔ بلکہ آلاتِ پیدائش سے اشبہ ہے اس لیے اس کی قیمت پر زکوٰۃ عائد کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس کو خارج کرنے کے بعد اس کاروبار میں ختم سال پر بجز "نقد موجود" (CASH IN HAND) یا بینک بیلنس کے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی جس پر زکوٰۃ عائد ہو۔ حالانکہ کاروبار لاکھوں کا ہوتا ہے بلکہ اب تو اس نوعیت کے کاروبار بہت بڑے پیمانے پر چل رہے ہیں۔ ان وجوہ سے میں نے کاروبار کی "مالیت" کا ایک خاص معیار سوچا ہے لیکن یہ بالکل اجتہادی چیز ہے اور اس پر دوسرے اہلِ علم کو بھی غور کرنا چاہیے۔

مالِ ظاہر اور مالِ باطن میں فرق کرتے ہوئے آپ نے جو اعتراض کیا ہے، وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اگر کسی مال کے مالِ باطن ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہو، یا مالِ باطن کا جو اعلان صاحب مال نے کیا ہو اسے محصل تسلیم نہ کر رہا ہو، تو ان دونوں صورتوں کا فیصلہ ایک غیر جانبدار عدالت کر سکتی ہے۔ یہ

کوئی ایسی پیچیدگی نہیں ہے جسے حل نہ کیا جا سکتا ہو۔

اُردو زبان اور موجودہ حکمران

سوال۔ آپ اس حقیقت سے بہت زیادہ واقف ہیں کہ مشرق کی عظیم عوامی زبان اردو ہی واحد زبان ہے کہ جس کو ہم دولتین پاک و ہند کی بین المملکتی زبان قرار دے سکتے ہیں عوامی رابطہ مشرقی و مغربی پاکستان کے اعتبار سے بھی اردو ہی بین عوامی زبان کہلائی جا سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بھی اردو ہی واحد بین العلاقائی زبان ہے۔

اُردو کی دولت مندی، اعلیٰ استعداد علمی و صلاحیت دفتری حضرت والا سے مخفی نہیں۔ اس کے باوجود آج پندرہ سال کی طویل مدت گزر گئی لیکن اردو کا نفاذ مغربی پاکستان میں بحیثیت سرکاری، دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان نہ ہو سکا۔

جناب وزیر قانون حکومت پاکستان کے انکشافات آپ کی نظر سے گذرے ہو نگے۔ موصوف نے اپنے ارشادات میں واضح کیا ہے کہ ۱۹۷۲ء تک انگریزی استعمال کی جا سکتی ہے، یا انگریزی کا استعمال کیا جائے گا۔ اور ۱۹۷۲ء میں ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو اس بات کا جائزہ لے گا کہ انگریزی کے بجائے کونسی زبان متبادل ہو گی۔ عزیز صاحب موصوف کے متذکرہ صدر ارشادات سے شیدایانِ اردو کو از حد صدمہ ہوا۔ اور بڑی حد تک مایوسی طاری ہو گئی۔

مجھ جیسے کروڑہا شیدایانِ اردو کی جانب سے اس وقت زبان اردو کو آپ کی طاقتور معاونت کی شدید ضرورت ہے۔ ازراہِ کرم اس خصوص میں اپنے بصیرت افروز ارشادات سے میری رہنمائی فرمائیں[1]۔

جواب۔ اردو زبان کے لیے آپ جو کوشش فرما رہے ہیں، میں ان کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں

[1] قارئین کے لیے اس امر کا علم موجب دلچسپی ہو گا کہ یہ سوال ایک طویل خط کا اقتباس ہے، جو ایک غیر مسلم پاکستانی

اردو زبان کے راستے میں اصل رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا بالائی طبقہ چونکہ خود انگریزی ماحول میں پلا ہوا ہے اور اردو لکھنے بولنے پر قادر نہیں ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے جیتے جی ساری قوم پر انگریزی زبان مسلط رہے۔ پھر یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی انگریزیت ہی کے ماحول میں پرورش کر رہے ہیں، اور اس بات کا انتظام کر رہے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور آئندہ انہی کی نسل کے قبضے میں رہے۔ اس لیے ۱۹۷۲ء میں بھی اس امر کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی کہ اردو زبان کو یہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنانے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کمیشن کی تجویز صرف طفل تسلی کے لیے ہے تاکہ وقت ٹالا جائے اور مطالبہ کرنے والوں کو فی الحال کم از کم دس سال کے لیے چپ کرا دیا جائے۔ ہماری مصیبتوں کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ ان دیسی انگریزوں سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انگریز خود تو چلا گیا ہے مگر اس کا بھوت ہمیں چمٹ کر رہ گیا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی بن باپ کے پیدائش

سوال ۔ لوگوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ان کا طریق استدلال یہ ہے کہ جب فرشتے نے حضرت مریمؑ کو خوشخبری سنائی کہ ایک پاکیزہ لڑکا تیرے بطن سے پیدا ہوگا تو انہوں نے جواب دیا کہ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور نہ میں بدکار ہوں۔ جب خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی اگر اس وقت حضرت مریم کو کنواری مان لیا جائے اور بعد میں یوسف نجار سے ان کی شادی ہو گئی ہو اور اس شادی کے بعد حضرت مسیحؑ کی پیدائش ہو تو کیا خدائی وعدہ سچا ثابت نہیں ہوگا؟

ان کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ خدا اپنی سنت نہیں بدلتا اور اس کے لیے وہ

✽ نے لکھا ہے اور جس میں اردو زبان کی ترویج پر بہت زور دیا گیا ہے۔ (ترجمان)

قرآن کی ایک آیت پیش کرتے ہیں: "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" وہ کہتے ہیں کہ لڑکے کی پیدائش ایک عورت اور ایک مرد کے ملاپ کا نتیجہ ہے کیونکہ ازل سے یہ سنۃ اللہ ہے اور یہ اب تک قائم ہے۔

براہ کرم واضح کریں کہ یہ استدلال کہاں تک درست ہے، اگر وقت کی کمی کے باعث طویل جواب لکھنا آپ مناسب نہ سمجھیں تو کتابوں کا حوالہ ہی ہمارے لیے کافی ہوگا۔

جواب- میں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم کی تفسیر کرتے ہوئے بالتفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے باپ پیدا ہونے کے دلائل دیئے ہیں۔ ان کو ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے بعد آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت مسیح کی معجزانہ ولادت کے منکرین کا استدلال کہاں تک درست ہے۔

یہ کہنا کہ اللہ اپنی سنت نہیں بدلتا، اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر اللہ کی سنت کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس کا فیصلہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ اللہ خود ہی ہے۔ جس چیز کو خدا نے خود اپنی سنت کہا ہو اس کے خلاف تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر جسے ہم اس کی سنت قرار دے لیں اس کے خلاف بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے اس کی پابندی کا کوئی ذمہ نہیں لیا ہے۔ آخر اللہ نے یہ کب کہا ہے کہ مرد کے بغیر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونا میری سنت کے خلاف ہے، یا میری سنت یہ ہے کہ عورت کے ہاں صرف مرد کے ملاپ ہی سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بنی نوع انسان کے اوّلین فرد اور اس کے جوڑے کی پیدائش آخر کس مرد اور عورت کے ملاپ کا نتیجہ تھی؟ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور ان کے جوڑے کو ان سے پیدا کیا۔ اگر اس جوڑے کی پیدائش سنت اللہ کے خلاف نہیں تو حضرت مسیح کی بغیر والد کے پیدائش کیوں سنت اللہ کے خلاف ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود بھی مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے تشبیہ دی ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى كَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران: آیت ۵۹) "درحقیقت عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے جسے اللہ نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا کہ ہو جا اور بس وہ ہو گیا۔"

مطبوعات

الاتقان حصہ اوّل تالیف علامہ جلال الدین سیوطیؒ۔ ناشر: نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔

زیر تبصرہ کتاب شیخ جلال الدین عبد الرحمن السیوطی (۸۴۹ - ۹۱۱ ھ) کی شہرۂ آفاق فاضلانہ تصنیف الاتقان فی علوم القرآن کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب قرآن فہمی کے معاملے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ پہلا حصہ مکی اور مدنی آیات، حضری اور سفری آیات، نہاری اور لیلی آیات، صیفی اور شتائی آیات کی شناخت پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قرآن کی جمع اور ترتیب، متواتر، مشہور، آحاد، موضوع اور مدرج قرائتیں، قرآن کے غریب الفاظ کی معرفت، قرآن میں غیر حجازی زبان کے عربی الفاظ اور غیر عربی الفاظ اور اسی نوعیت کے سیکڑوں ادق مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جو شخص بھی قرآن پاک کی گہرائی میں اتر کر مطالعہ کرنے کا آرزومند ہے وہ اس فاضلانہ تصنیف کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کے پڑھنے سے قرآن فہمی کے اصول سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے اور علومِ قرآنی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ فاضل مصنف کے تبحرِ علمی، وسعتِ نظر اور ذوقِ تحقیق کو دیکھ کر ایک انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ آج سے کئی صدیاں پیشتر جبکہ لوگوں کو مطالعہ اور تحقیق کی یہ سہولتیں میسر نہ تھیں ایک شخص نے کس طرح اتنا بڑا علمی کارنامہ سر انجام دیا۔

لیکن انسانی کوشش خواہ وہ کتنی ہی بلند پایہ ہو کبھی بھی خطا سے یکسر پاک اور منزہ نہیں ہو سکتی۔ یہی حال اس فاضلانہ تصنیف کا بھی ہے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ چونکہ بدر الدین زرکشی کی کتاب البرہان سے ماخوذ ہے اس لیے اس میں وہ بہت سی اغلاط شامل ہو گئی ہیں جو اس کتاب میں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اسباب النزول کی بحث میں یہ بات درج کر دی گئی ہے کہ حضرت عثمان

بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عہد فاروقی میں شراب پی۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے، وہ صحابی جن سے یہ فعل سرزد ہوا وہ حضرت عثمان بن مظعون نہ تھے بلکہ حضرت قدامہ بن مظعون تھے۔ اسی قسم کی اور کئی غلطیاں کتاب میں ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کمزور روایات بغیر تحقیق اس میں درج ہو گئی ہیں جو بسا اوقات کئی ایک غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں اور جن سے دشمنانِ قرآن فائدہ اٹھاتے ہیں۔

علومِ قرآن کے اس دائرۃ المعارف کا ترجمہ پہلی بار مولانا محمد حلیم انصاری نے کیا اور یہ ۱۹۰۸ء میں فیض بخش پریس فیروز پور میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ اب نصف صدی گزر جانے کے بعد نور محمد اصح المطابع نے اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسے دو بلند پایہ علماء سے نظرثانی کروا کر بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ آغاز میں مولانا محمد عبدالحلیم صاحب چشتی کے قلم سے علوم القرآن کی تاریخ پر ایک فاضلانہ مقالہ بھی درج ہے۔ کتاب ۶۶۹ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ۱۲ روپے میں ناشر سے مل سکتی ہے۔

<u>الجمال والکمال</u> | تصنیف علامہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری۔ شائع کردہ المکتبۃ الرحمانیہ ۱۲-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

رحمۃ للعالمین کے فاضل مصنف علامہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب الجمال والکمال اسی یگانۂ روزگار شخصیت کے قلم سے سورۃ یوسف کی تفسیر ہے۔ اس کتاب میں بھی ان کے فکر و نظر کی وہ ساری خوبیاں پوری طرح نمایاں ہیں، جو ہمیں رحمۃ للعالمین کے اندر دکھائی دیتی ہیں۔ وہی سوز و گداز، وہی جذبات کی لطافت، الفاظ کی شیرینی و سلاست، زبان و بیان کی مٹھاس، علم کی گہرائی، ذوقِ تحقیق اور مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔ ان کی ہر تحقیق میں قدامت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدت کی تازگی، یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت کا طرۂ امتیاز۔ ان کی یہ دو کتابیں پڑھ کر نہ صرف ذہن کو سکون میسر آتا ہے بلکہ قلب کو بھی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اگرچہ صرف سورۃ یوسف کی تفسیر ہے لیکن اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر علامہ موصوف نے معانی و حقائق کا پورا شہرستان دکھایا ہے اور اس میں اُن کے پیش نظر تفسیر کے وہ تمام بنیادی اصول رہے ہیں جو اہلِ علم کے نزدیک مسلّم ہیں۔ یعنی عربیت کی جامعیت، روایاتِ صحیحہ کا اہتمام، اور بیّن اور واضح قرائن کے مطابق مختلف نکات کی توضیح۔ یہ تفسیر ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ البتہ ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے جس کی طرف مولانا غلام رسول مہر نے بھی مقدمہ میں اشارہ کر دیا ہے کہ کتاب کے فاضل مصنف نے مصر کے متعلق یوں تو بیش قیمت معلومات جمع کی ہیں مثلاً اس کا محلِ وقوع، حدودِ اربعہ، مساحت، آبادی، اُس کے پہاڑ اور دریا وغیرہ لیکن مرحوم حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے مصر پر توجہ نہ فرما سکے۔ حالانکہ تفسیر کے سلسلے میں اس کی خاص ضرورت تھی۔

کتاب کا معیار طباعت عمدہ ہے۔

عبقات تالیف: حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ۔ مترجم: علامہ سید مناظر احسن گیلانی شائع کردہ: اللجنۃ العلمیہ، چھل گوڑہ، حیدر آباد ۴۔ صفحات ۲۸۵۔ قیمت مجلد دس روپیہ ۵۰ نئے پیسے

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی یہ فاضلانہ تصنیف فلسفہ اور تصوف سے بحث کرتی ہے۔ اب علامہ گیلانیؒ کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ دنیا کے سامنے آیا ہے۔ اس ادق کتاب کو علامہ موصوف جیسا فاضل شخص ہی اردو کا جامہ پہنانے کی ہمت کر سکتا ہے اور واقعی انہوں نے بڑی محنت سے اس فرض کو سرانجام دیا ہے لیکن کتاب چونکہ بڑی دقیق ہے اس لیے زبان کے اردو ہونے کے باوجود بہت سے مسائل سمجھ میں نہیں آنے پاتے۔ کاش اس موضوع پر دسترس رکھنے والا کوئی بلند پایہ عالم اس کتاب پر تشریحی حاشیے لکھ کر اس کے مشکل مقامات کی وضاحت کرے۔ موجودہ صورت میں کتاب، خواص کے بھی نہیں صرف اخص خواص کے کام کی ہے۔

فلسفہ دعا تالیف: پروفیسر فضل احمد صاحب عارف ایم، اے۔ شائع کردہ: مکتبہ رشیدیہ، منٹگمری

دعا در حقیقت انسان کا ایک ایسا فطری داعیہ ہے جس کے تحت وہ اپنے

خالق کے سامنے اپنی بے کسی اور بے بسی، اپنے عجز اور ضعف کا اظہار کرتا ہے۔ دعا کو انسانی فطرت سے کبھی بھی الگ نہیں کیا جا سکتا انسان جب تک انسان ہے اس وقت تک کسی بزرگ و برتر طاقت کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے۔

اسلام نے انسان کے اسی فطری احساس کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہوئے اُسے دُعا کے صحیح آداب سکھائے ہیں اور اسے بتایا ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے سامنے انسان کو دستِ سوال دراز کرنا چاہیے۔ اُس ایک مالکِ حقیقی کے علاوہ کوئی دوسرا کارساز اور حاجت روا نہیں۔

پروفیسر فضل احمد صاحب نے اپنی اس فاضلانہ تصنیف میں دعا کی حکمت اور افادیت، اسلام کے تصوّرِ دُعا، قبولِ دعا کے طریق، قرآنی دعاؤں کے خصائص پر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں بحث فرمائی ہے۔ آخر میں قرآنی دعائیں بھی نقل کر دی ہیں۔

کتاب اپنے موضوع پر بڑی عمدہ اور قابلِ قدر ہے لیکن بعض پہلو ایسے ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مغرب کے بیشتر فلاسفہ نے دعا کی افادیت کو تو تسلیم کیا ہے لیکن اُن کے اندر اُس رواقی لاپروائی" کا رجحان بھی صاف نظر آتا ہے جس سے دعا کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پھر دعا کو ایک نفسیاتی حربہ کہنا درحقیقت اُس ایقان کی نفی ہے جو ایک زندہ جاوید اور قادرِ مطلق ہستی پر ایمان انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف نے اس بحث کو تو اٹھایا ہے کہ کیا دعا ہمیشہ زیردستوں کا سہارا رہا ہے لیکن اس پر تسلی بخش بحث نہیں کی ہمیں امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں پروفیسر صاحب مغربی فلاسفہ کے ان غلط اقوال کی اچھی طرح نشاندہی کر دیں گے۔

اسی سلسلہ میں ہم پروفیسر صاحب کی خدمت میں یہ بھی گذارش کریں گے کہ کتاب میں انہوں نے جن مصنفین کی آراء درج کی ہیں ان کے ساتھ پورا پورا حوالہ درج کرنا چاہیے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں انشاء اللہ بہت اضافہ ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف ہماری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ کتاب کا معیارِ طباعت عمدہ ہے۔

(بقیہ اشارات)

اخلاق کا جنازہ نکل رہا ہے۔ یہ ایک ایسی اندوہناک صورتِ حال ہے جسے اس ملک کا ہر بہی خواہ بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ان کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند کی گئی اور حکومت سے پیہم مطالبہ کیا گیا کہ خدارا نوخیز نسلوں پر رحم کرتے ہوئے ان سرگرمیوں کو بند کرو۔ خصوصیت کے ساتھ مارشل لا کے زمانہ میں ان اخلاق سوز سرگرمیوں کے اندر جس قدر بے تحاشا اضافہ ہوا ہے اس پر تو ملک کے عوام چیخ اٹھے ہیں۔

شاید اسی عام بے چینی کو دیکھتے ہوئے محکمۂ تعلیمات مغربی پاکستان نے تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو یہ ہدایات جاری کیں کہ تعلیم گاہوں میں ناچ گانے اور عشقیہ ڈراموں کے پروگرام نہ رکھے جائیں۔ ان ہدایات کا ایک نہایت ہی قلیل طبقہ کو چھوڑ کر، جو ثقافت گزیدہ ہے ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا۔

محکمۂ تعلیم کے اس دانشمندانہ اقدام پر تہذیبِ مغرب کے "فرزندوں" کی برہمی کچھ غیر متوقع نہ تھی۔ اس ملک کے اربابِ اختیار نے ان حلقوں کی جس انداز سے حوصلہ افزائی بلکہ پشت پناہی کی ہے، اس سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور اب وہ کھل کر تہذیب اور ثقافت کے نام پر احکامِ الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چنانچہ محکمۂ تعلیم کے اس اعلان پر بھی ان لوگوں نے بڑے غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ ان حالات میں توقع یہ تھی کہ اربابِ اقتدار عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان اسلام دشمن عناصر کے نالہ و شیون کو بالکل درخورِ اعتناء نہ سمجھیں گے اور محکمۂ تعلیم نے جو عقلمندانہ فیصلہ کیا ہے اُسی پر قائم رہیں گے۔ لیکن وزیرِ تعلیم صاحبہ کے حالیہ بیان کو دیکھ ہماری توقعات خاک میں مل گئی ہیں اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس ملک کا حکمران طبقہ اسلامی احساسات ہی سے نہیں بلکہ عقل و دانش سے بھی بالکل عاری ہو چکا ہے۔ حکمرانوں کا جو گروہ عوامی احساسات سے اس قدر بیگانہ ہو کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکے کہ ہمارے کسی بیان کا عوام میں کیا ردِ عمل ہو گا اور اُس سے

اُس کی اپنی پوزیشن پر کیا اثر پڑیگا، اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ قوم کی صلاحیتوں کو کسی تعمیری کام پر لگانے میں کامیاب ہوگا، محض ابلہ فریبی ہے۔ پھر اُن کے اس بیان سے اُن خوفناک عزائم کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو یہ حضرات اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک "اسلام" صرف ایک نعرہ ہے جس سے اس ملک کے عوام کو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر انہیں اس دین سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے کہ وہ کبھی کبھار اس کا ذکر کر کے عوام کو بزعم خود دھوکہ دے لیتے ہیں ورنہ اُن کی عقیدت کا اصلی مرکز و محور "تہذیبِ مغرب" ہے۔ اسی کی محبت میں وہ زندہ ہیں اور اسی کی برتری قائم کرنے کے لیے وہ ہر قسم کے جوڑ توڑ کرنے میں مصروف ہیں۔

ہم ذیل میں بیگم صاحبہ کے بیان کا متن درج کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو دیا ہے۔ اُس سے آپ اِن لوگوں کے رجحانات کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔

"وہ کالجوں اور سکولوں میں موسیقی اور ڈرامے، اور اسی نوع کی دوسری سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے، طالب علموں کو "ملّا" بنانا نہیں چاہتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں بھی تو تعلیم کا ہی جزو ہیں"

اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ موسیقی اور عشقیہ ڈراموں پر پابندی لگانے کے معاملے میں محکمہ تعلیمات کے ناظمین کو ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ صوبائی حکومت اس ضمن میں جو قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتی تھی وہ صرف اسی قدر تھا کہ لڑکیاں اُن عشقیہ ڈراموں میں حصہ نہ لیں جنہیں مرد اور عورتیں دونوں دیکھنے کے لیے آتے ہیں کیونکہ اس پر بعض والدین معترض ہیں۔ باقی رہیں بجائے خود یہ سرگرمیاں تو طلبا اور طالبات سکولوں اور کالجوں میں ڈرامے سٹیج کرنے اور رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرنے میں بکلی آزاد ہیں کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق اس قسم کی سرگرمیوں سے طلبا کے اندر وسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے اور ان کی شخصیتوں کی

نشو و نما میں انہیں مدد ملتی ہے۔

انہوں نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ محکمۂ تعلیم نے علاقائی ناظمین کو اس قسم کا کوئی مراسلہ جاری کیا ہے جس میں تعلیمی اداروں کے اندر ان ثقافتی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی ہدایات درج ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے محکمۂ اطلاعاتِ عامہ کو اس معاملے میں ایک وضاحتی اعلان جاری کرنے کا حکم دے دیا ہے تاکہ لوگوں کے اندر محکمۂ تعلیم کے حالیہ فیصلے کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہو چکی ہے وہ دور ہو، کیونکہ اُسے حکومت کے حقیقی منشا کا کسی طرح بھی ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔"

وزیر نی صاحب کے اس بیان پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اسی قدر کم ہے۔ اسی سے ملک کی صورتِ حال کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطۂ پاک اس وقت جس قسم کے خطرات میں گھرا ہُوا ہے، ان میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقتدار اور عوام کے درمیان جو بُعد اور بیگانگی ہے وہ ختم ہو اور حکومت عوامی تمناؤں اور قومی آرزوؤں کی نہ صرف مظہر ہو بلکہ انہیں بروئے کار لانے میں پوری نیک نیتی، خلوص اور عزم سے جد و جہد کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اقتدار کے بارے میں جو بدگمانیاں موجود ہیں وہ یکسر ختم ہو جائیں اور اس ملک کے عوام اور حکمران طبقے یک جان ہو کر خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ لیکن اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقے کی ابھی تک آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ اسی ڈگر پر چل رہا ہے جس پر اس کے فرنگی پیشوا تقسیمِ ملک سے پہلے گامزن تھے۔

اگر ان لوگوں کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کا کوئی پاس نہیں تو انہیں کم از کم اپنے مغربی آقاؤں کی روایات کا تو کچھ احترام کرنا چاہیے۔ کیا وہ بھی اپنی قوم کے جذبات کے ساتھ اسی طرح کھیلتے ہیں جس طرح یہ کھیل رہے ہیں۔ وہ تو حکومت کی مسند پر عوام کی تائید سے آتے ہیں پھر انہی کے احساسات کی ترجمانی اور انہی کے مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کرتے ہیں اور بالآخر جب قوم کی

اکثریت ان سے مسندِ اقتدار چھوڑ دینے کا اشارہ کرتی ہے تو وہ بلا چون وچرا اس سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ کیا کبھی ان مغربی ممالک میں بھی کسی حکمراں نے عوامی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے کی اس طرح جسارت کی ہے جس طرح یہاں کی جاتی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ کو مغربی اقدارِ حیات عزیز ہیں تو وہ اپنے گھر میں اپنی ذاتی حیثیت میں جو کچھ چاہیں کرتی رہیں لیکن انہیں وزیر کی حیثیت سے ملک کی حکومت کی پالیسی اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق چلانے کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ ان کا فرض ہے کہ جس قوم کے ملک کا وہ انتظام کر رہی ہیں اس کی اکثریت کے منشا کے مطابق یہاں کام کریں۔ جن محنت کشوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ اور الاؤنس کی شکل میں انہیں ملتے ہیں اُن کے نزدیک یہ سرگرمیاں فکر و نظر کی بالیدگی کی موجب نہیں بلکہ متاعِ ایمان کی بربادی کا ذریعہ ہیں آپ انہیں شخصیت کی تعمیر کے لیے مفید اور کارآمد خیال کرتی ہیں تو کیا کریں، مگر جن کی آپ نوکرانی ہیں ان کو اس بات کا یقین ہے کہ ان کے فروغ پانے سے اُن کی نوخیز نسلیں اسی دنیا میں تباہ ہو جائیں گی، اُن پر ذلت اور مسکنت طاری ہو جائے گی اور آخرت میں انہیں رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ سرگرمیاں ان کی نظر میں خدا اور اس کے رسول سے بغاوت کے مترادف ہیں۔ وہ جس نظامِ تعلیم کے لیے اپنے دل میں جذبۂ احترام رکھتے ہیں اور جسے وہ اپنی دنیوی فلاح اور اخروی کامیابی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اُس میں ان اخلاق سوز سرگرمیوں سے خود بچنے اور پوری نوعِ بشری کو بچانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ آپ نے مسندِ اقتدار پر براجمان ہو کر ناظمینِ تعلیم کو یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ اس قسم کی اخلاق سوز سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کرنے کی جرأت نہ کریں اور اگر انہوں نے اس قسم کا کوئی رجعت پسندانہ فیصلہ کر دیا ہے تو اسے جلد از جلد واپس لے لیں تاکہ "ان مشاغل" کی ترقی کی رفتار میں کوئی کمی نہ واقع ہونے پائے لیکن یہ ملت اپنے دل میں جن حکمرانوں کے لیے واقعی عقیدت رکھتی ہے اور جو اس کے حقیقی محسن اور مربی ہیں اور جن کے زندہ جاوید اور روشن کارنامے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آج بھی اُس کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں، انہوں نے ان مشاغل سے اس ملت کو ہمیشہ باز رکھنے

کی تلقین کی۔ اسی قسم کا ایک حکم نامہ خلیفۃ الرسول حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بچوں کے ناظمِ تعلیم کو جاری فرمایا تھا۔ ذرا اس حکم نامہ کو بھی ملاحظہ فرمالیجیے:۔

لیکن اول ما یعتقدون من ادبک بغض الملاھی التی بدؤھا من الشیطٰن وعاقبتھا سخط الرحمٰن فانہ بلغنی عن الثقات من اھل العلم عن صوت المعازف واستماع الاغانی واللھج بھا ینبت النفاق فی القلب کما ینبت العشب علی الماء۔

سب سے پہلے تم میری اولاد کے دلوں میں باجوں گاجوں اور راگ راگنیوں کی نفرت پیدا کرنا، کیونکہ اُن کی ابتداء شیطان کی طرف سے ہے اور ان کی انتہا خدائے رحمان کی ناراضگی ہے۔ مجھے اپنے زمانہ کے نہایت ثقہ علماء سے یہ بات پہنچی ہے کہ اس سے دل میں نفاق اس طرح پرورش پاتا ہے جس طرح بارش سے گھاس اُگتی ہے۔

ترجمان القرآن کے پُرانے پرچے درکار ہیں

شاہ ولی اللہ اورنٹیل کالج منصورہ کی لائبریری کے لیے ترجمان القرآن کے پرانے پرچے از سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۴۷ء درکار ہیں۔ جن صاحب کے پاس یہ پرچے موجود ہوں وہ راقم الحروف سے مراسلت کریں۔

محمد سلیم
پرنسپل ولی اللہ اورنٹیل کالج
منصورہ براہ ٹنڈو آدم
